ماہنامہ

د نمبر ۱ — غالب نمبر — شمارہ نمبر ۲-۳

جموں و کشمیر سے شائع ہونے والا واحد ادبی رسالہ

ماہنامہ نوری چھم (غالب نمبر)

جلد نمبر (۱) — فروری و مارچ ۱۹۶۹ء — شمارہ نمبر (۲-۳)

مجلس مشاورت

زر سالانہ ۱۰ روپے

قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

ماہنامہ نوری چھم
موتی بازار جموں (جموں و کشمیر)

ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر: نند گوپال باوا

مطبوعہ: جموں پرنٹنگ پریس

ٹائٹل و تصاویر: امر آرٹ پریس جموں

تاریخ پیدائش
سنہ ۱۷۹۶ عیسوی
سنہ ۱۲۱۲ ہجری
تاریخ وفات
سنہ ۱۸۶۹ عیسوی
سنہ ۱۲۵۸ ہجری
زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

اس شمارے میں

باهتمام

نند گوپال باوا پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر جموں پرنٹنگ پریس جموں میں چھپ کر

دفتر "نوری چھم" تار اہوٹل موتی بازار جموں سے شایع ہوا۔

نوری چھم {تعارف}

از چودھری دیانند کپور صاحب (پونچھ)

چھم چھم نور برسے یا چھم چھم "نوری ناچے" یہ حقیقت ہے کہ بیگم نوری اور یہاں نور کو اس نور سے کوئی نسبت نہیں جو صبح کا تارہ اُفق سے بکھیرتا ہے اور ذروں کو جگمگاتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے "بشر اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے"۔ نور یا نار بشر کی فطرت میں ہو یا نہ ہو۔ نوری اور نور کے نام اگر انسان نے رکھ لئے تو اس سے نور اور نار کے کام میں کوئی فرق نہ پڑا۔ نہ نور نے جگمگانا چھوڑا۔ نہ آگ نے جلانے کی خصلت بدلی۔

نوری یا نار ہندی نہیں "چھم" ہندی ہے۔ چھم چھم نے نوری کو خالص بناسپتی بنا ڈالا تو اس لئے کہ نور برسانے والی نوری بھی سودیشی ہے اور "چھم چھم" جبا جھران بھی سودیشی ہیں۔ نوری چھم کا نام شاید آپ کے ذہن میں بھی "نوری ناچ" کا تصور پیش کرے لیکن نوری چھم اس تصور کا آئینہ دار نہیں۔ نوری چھم ایک تاریخی حقیقت کی "یاد" پیش کرنے کا جذبہ ہے جو تاریخ میں نوری آبشار کے نام سے موسوم ہے۔

چھم برسنے کے معنی میں آتا ہے۔ پہاڑی زبان میں چھم آبشار یا پانی کی چادر گرنے کے سلسلے میں مستعمل ہے۔ نوری آبشار بھی پہاڑوں کی اوٹ میں اپنا حسن و جلال بکھیرتا ہے اس لئے پہاڑی دنیا میں نوری چھم کے نام سے مشہور ہے۔

نوری آبشار کی بجائے اس رسالہ کو نوری چھم کا نام دینا درست نہیں۔ لیکن درست ہو یا غلط۔ پہاڑی عوام کے عوامی نام پر تقلید دوام کی مہر لگ چکی ہے تاریخی دور بدلتے رہتے ہیں۔ نام نہیں بدلتے، یہ نام چاہے بگڑی صورت میں ہوں یا صحیح شکل میں۔ نوری آبشار کی شبنمی چادر کی اوٹ میں "نوری چھم" کا نام وہ عوامی نام ہے جو سرورق کی زینت ہے۔

والا آبشار "نوری آبشار" کہلایا کہ آج بھی لڑھکتا ہوا، اوپر دیتا ہوا، اُچھلتا ہوا، گنگناتا ہوا مسلسل رواں دواں ہے۔ انقلابات آئے دور بدلے نوری آبشار کی روانی میں فرق نہ آیا۔ اس کا نام اور اس کا کام برابر جاری ہے۔ اس کی شبنمی چادر سے لطف اندوز ہونے اور اسے اپنی پیاری ملکہ نورجہاں کا نوری لقب بخشنے والا شہنشاہ جہانگیر نہیں رہا اس کا دیا ہوا نام باقی رہ گیا۔ پامینی مٹ گئی پامینی کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ نہ سکا۔ یہی تاریخ کا زریں کارنامہ ہے۔

دنیا بھر کے عظیم آبشاروں کی بات جانے دیجئے ہندوستان میں ہی اس سے عظیم آبشار گرج رہے ہیں۔ پونچھ کے پہاڑوں میں گرجنے والا یہ آبشار نہ عظیم ہے نہ یکتا لیکن نوری آبشار کا نام جتنا مشہور ہے۔ اتنی شہرت کوئی آبشار نہ پا سکا۔ یہی نوری آبشار کی عظمت کا راز ہے۔

"نوری آبشار" کی میٹھی اور ٹھنڈی پھواروں میں جہانگیر نورجہاں بھی بھیگتے رہے آپ بھی بھیگ سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کا ذوق و شوق آبشار کی پھواروں میں بھیگنے کا لطف اٹھانا چاہیئے۔ شہنشاہ کے پہلو میں بھی وہی دل دھڑکتا ہے جو عوام کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ لیکن دل کی دھڑکن میں سوز، تڑپ اور ذوق کہیں کہیں جاگ اٹھتا ہے جب یہ جاگے تو نوری آبشار کی پھواروں میں جام و مینا کا سرور بھی اُچھلتا ہے اور روحان کا نور بھی۔ جہانگیر نے آبشار کے ستاروں میں دونوں بہاروں کے نام منڈھ جائے جشن اور شراب نوری آبشار کی جھلملاتی پھوار نہ جنت سرا کے حصے میں نہیں آسکتی۔ پھر وہ جنت جہاں خدا کا حکم نہیں۔ شہنشاہ جہانگیر کے فیصلہ "کن" "کن" سے جان جاتی ناچ اُٹھتی تھیں اور پھوار کے کانوں رنگارنگ شاداب ہوا رکھا جاتے تھے۔

کیا آپ کے یا میرے حصے میں ایسی جنت آسکتی ہے۔ بہرام کلہ کے "نوری چھم" سے چند فرلانگ دور چندی مرٹھ میں وسیع کھنڈرات مغل دور کی عظمت کی نشان برداری کرتے ہیں۔ ان ہی کھنڈروں کے محلات میں نورجہاں کے آئینہ خانے بھی تھے اور جہانگیر کی بارگاہ بھی۔ اسی شبستان عشرت کے مرصع کمروں کے زربفت اور کمخواب کی بالائی چلمنوں کی اوٹ میں حسن کے جلوے لہراتے تھے۔ اور عشق آسودگی پاتا تھا۔ یہ محلات اشیر گڑھی، لال قلعہ، سیکری کے محلات نہیں۔ تھے۔ عارضی کیمپ کے محلات یا شاہی سرائے تھی۔ جس سرائے میں مغل تاجدار شوپیاں کے لالہ زار مرغزاروں میں سے کشمیر آتے جاتے۔ چند دن ٹھہرتے تھے۔ نوری آبشار کے بالائی جنگلوں میں شکار کھیلا جاتا اور نوری آبشار کی فواروں میں ارغوانی کے دور چلتے۔ عشق پیتا تھا حسن پلاتا تھا۔ آبشار تماشائی تھا اور اس کی گرجتی، اچھلتی قہقہے لگاتی "حسین فطرت نور بکھرتی نہ جانے کس منزل کو پانے کے لئے رواں دواں تھی۔ اس منزل کے کتنے کارواں گم ہوگئے منزل کا پتہ نہ تب تھا نہ اب ہے۔ وقت کے انتھاہ ساگر میں سب ڈوب چکا ہے۔

مغل تاجدار کی شکارگاہ، مغل روڈ اور آبشار کے عمودی کناروں کے پختہ چبوتروں کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ پنچ کے گرداب کے دونوں کناروں پر سنگ مرمر کے چبوترے اور چبوتروں کی پس پشت قد آدم آئینے نصب تھے۔ یہ آئینے بنگال سے ہاتھوں پر لاکر یہاں پہنچے اور اس لئے نصب کئے گئے کہ آمنے سامنے کے چبوتروں کے درمیان پانی کی شبنمی چادر میں سے ایک چبوترے سے دوسرے چبوترے پر بیٹھے محبوب نگاہوں کے وصال کا لطف آئے۔ اس آبشار نے جل پریوں کے نغمے بھی سنے پریوں کے نوری ناچ بھی دیکھے، نورجہاں کے بلوریں ہاتھوں سے جام بھرتے بھی دیکھے اور شہنشاہ کی انگلیوں میں چھلکتے جام بھی دیکھے۔ آبشار کی شبنمی چادر میں آتشبازی کی پھلجھڑیوں کے ستارے بھی اچھلتے دیکھے اور مومی شمعوں کی قطاروں کو بھی جلتے دیکھا۔ رنگ نور اور نغمے کا سرور نورجہاں کے نقرئی قہقہوں میں نوری آبشار کی دھاراؤں میں آج بھی رچا ہوا ہے۔

پھر نوری آبشار نے اپنے چاہنے والے جہانگیر کا جنازہ بھی جاتے دیکھا جس کے مرنے نے بیٹھی نوری آنکھوں سے ابلتے آبشار کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ نورجہاں بھی چلی گئی لیکن نوری آبشار بہتا رہا اسی شان سے بہتا اور اچھلتا رہا جس شان میں اسے نورجہاں چھوڑ گئی۔

بہرام کلہ کی عمودی چوٹی سی گونجتی ندی کی دھارا کو تھاج سے جھٹکے پانی کی طرح چٹانوں کے گرداب میں گم ہوتے اور اچھلتی فوارہ کا نام "نوری چھم" ہے۔ یہی نوری چھم اس رسالہ کا نام ہے، نوری چھم کو جو .... ابدی اور سرمدی نغمہ فطرت کی طرف سے عطا ہوا ہے خدا کرے وہی ابدی شان نوری چھم کے حصے میں بھی آئے نوری چھم کی خالق وہ برفانی جھیلیں ہیں۔ جو "گرجن" کے مرغزاروں اور برفانی چوٹیوں میں چھپی ہوئی ہیں جن کے کنارے دیوار کے درختوں کی چوٹیاں آسمان کو چھو رہی ہیں اور پرندوں کے جھنڈ جھیلوں کی نیلی سطح پر رقص کرتے گھوم رہے ہیں۔ "نوری چھم" فطرت کی لازوال رحمت پر زندہ ہے لیکن آپ کا نوری چھم آپ کی نگاہ کرم کا محتاج ہے۔ مالی اور قلمی معاونت کی جھیلوں سے جو دھارائیں نکلیں گی وہی نوری چھم کی زندگی بن جائیں گی۔

"نوری چھم" کے دلکش منظر کے قلمی فوٹو ماضی اور حال کے واقعات کی صورت میں "نوری چھم" قسط وار شائع کرتا رہے گا یہ واقعات اور منظر کشی نہ صرف دل نواز ہوگی۔ بلکہ دلچسپ اور دلکش بھی ——————— !

رباعی

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب!

(غالب)

اپنی بات

مر گئے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا　　　اِس کو ناقدریٔ عالم کا صِلہ کہتے ہیں

مرزا بقیدِ حیات تھے تو اکثر لوگوں کی زبان پر یہ شعر رہتا تھا ؎

کلامِ میرؔ سمجھے یا زبان میرزا سمجھے　　　مگر اِن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر آج دُنیا بھر میں غالبؔ کے کلام کی جس قدر مانگ ہے وُہ اظہر من الشمس ہے۔ ملک بھر میں اُن کی صد سالہ برسی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ کلامِ غالبؔ کو لوگ اب کسی حد تک سمجھنے اور سراہنے کے قابل ہوئے ہیں۔ واقعی صاحب! ؎

یہ حرفِ سخت ہے شمعِ سحر سے کون کہے　　　اِک عمر چاہیئے دِل کے گداز کرنے کو

(روش صدیقی)

غالبؔ فہم حضرات جانتے ہیں کہ گفتۂ غالبؔ کا عرفان حاصل کرنے کے لئے کس کرید اور بصیرت کی ضرورت ہے ورنہ بیچارے زندہ دِل اور مرنجاں مرنج مرزا نے تو یہ کہہ کر اپنی وسیع المشربی کا ثبوت دیدیا تھا ؎

یارب وُہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　　دے اور دِل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

کتنی خوشی کی بات ہے کہ ستائش کی تمنا اور صِلے کی پرواہ نہ کرنیوالے مرزا کا کلام آج سب کے لئے جنّت نگاہ اور فردوسِ گوش بنا ہوا ہے۔ کاش آج حالیؔ ہوتے تو اپنی آنکھوں سے جہاں کے محبوب شاعر اور اپنے "قبلۂ کعبہ" کی یہ تکریم دیکھتے جنہوں نے "یادگارِ غالبؔ" لکھ کر شاگردی کا حق ادا کر دیا۔

جن صاحبوں کو غالبؔ کی عظمت کا صحیح ادراک ہے وُہ جانتے ہیں کہ دیوانِ غالبؔ کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اِس سدا بہار گلدستے میں ہر رنگ و بُو کے پھُول چُنے ہوئے اپنی گوناگوں بہار دکھاتے ہیں۔ کِسی کو مرزا کی شوخی و ظرافت پسند ہے تو کِسی کو اُن کی فلسفیانہ سنجیدگی و متانت۔ کلامِ غالبؔ کا مُطالعہ رندِ شاہد باز بھی کرتا ہے تو صُوفی خلوت نشین بھی۔ بھلا ایسی صُورت میں دیوانِ غالبؔ اُردو شاعری کا سرمایۂ افتخار کیونکر نہ ہو۔ آخر اُن کا سا اندازِ بیان اور اُن کی سی زباں کوئی کہاں سے لائے۔ فارسی کو تو خیر جانے دیجیے جس سے مرزا کا مرتبہ کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اُردو نثر میں بھی اُن کا کوئی جواب نہیں۔ مومنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ

یا اُن کے دُوسرے ہم عصر شعراء سخن ور یا صاحبِ دیوان بھی گر انہوں نے نثر میں کہیں گُل بُوٹے کھلائے ہیں جو غالب کی ہمسری کر سکیں۔ تفوق و تقدم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالب سب پر غالب ہیں۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا   صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

نوری چھم کا یہ شمارہ اردو کے اس عظیم المرتبت شاعر اور صاحبِ طرز نثر نگار کی صد سالہ تقریب کے سلسلے میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ موصوف کی حیات اور شاعری سے متعلق سینکڑوں شہرۂ آفاق کتابیں اب تک منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ بیسیوں شرحیں، متعدد علمی اور تنقیدی مضامین اور مقالے آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے۔ دیوانِ غالب کے مختلف نسخے بھی کئی ناشروں نے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ اکثر رسائل و جرائد میں بھی اُن کی نظم و نثر سے متعلق کتنے ہی بلند پایہ مضامین چھپ چکے ہیں۔ غالب پرست احباب نے اپنے اس محبوب شاعر کو جی بھر کر خراجِ تحسین ادا کیا ہے اور غالب شکن حضرات نے بھی کچھ کم دل کی بھڑاس نہیں نکالی ہے۔ جہاں اتنی شمعیں روشن ہوں اور اتنے چراغ جل رہے ہوں، ایک ننھے سے جگنو کی کیا بساط ہے اور یہ ننھا سا ٹمٹماتا ہوا جگنو نوری چھم کا شمارہ غالب نمبر ہے۔ کیسا ہے اور کس پایہ کا، کچھ ہے بھی یا نہیں، معائب کا عماز ہے یا محاسن کا آئینہ دار، یہ فیصلہ غالب شناس اور سخن فہم قارئین کرام پر چھوڑا جاتا ہے۔ ع مشک آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

البتہ آپ سے اپنی بات کہتے ہوئے مدیر نوری چھم کو کوئی باک نہیں کہ ہوشربا گرانی کے اس دور میں اتنا ضخیم اور پُر از معلومات جامع نمبر نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔ اس شمارہ پر ایک خطیر رقم صرف ہوئی ہے۔ لہٰذا اردو دوست احباب اور بالخصوص نوری چھم کے پروانوں سے التماس ہے کہ وہ اس سلسلے میں اس کی حتی المقدور مالی مدد فرمائیں تاکہ یہ روشن قندیل نہ بجھنے پائے۔

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض   ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

آخر میں ادارہ نوری چھم اُن تمام اہلِ قلم حضرات اور اکابرینِ ادب کا تہِ دل سے ممنون ہے جنہوں نے اپنی قلمی اعانت سے اسے نوازا ہے۔ اگر وہ مسلسل اسی طور اپنی دریا دلی کا ثبوت دیتے رہے تو بوثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ عنقریب نوری چھم کا شمار ملک کے سر برآوردہ اور موقر ادبی جرائد میں ہوگا۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے   ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

خدا کرے کہ پنڈت میکش کاشمیری صاحب کی یہ دُعا اس کے حق میں کارگر ثابت ہو۔

یہ سلامت رہے قیامت تک!   اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو!

(اننت گوپال باوا)

بہارستانِ غالب

{گل ہی گل}

دامانِ باغبان و کفِ گل فروش

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے !
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا !

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

نے گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز !!
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانی شمع

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

خوشحال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

لوزی جیم

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائیگا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

آبرو کیا خاک اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

نشۂ رنگ سے ہے واشُدِ گل !!
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں !!

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گذر میں خاک نہیں

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنے شوخی بہانے کی

گل فشانیہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا!
خاک پر ہوتی تھی تیری لالہ کاری ہائے ہائے

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
خوب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گُل فشانی کی

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش ہے

دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں!

وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گُل کا صدائے خندۂ دل ہے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے

گلشن کو تیری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گُل ہونا آغوش کشائی ہے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالب
اگر گُل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

بجا ہے گر نہ سُنے نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گُل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گُل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی!

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گُل پہ آب
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گُل آغوش کشا ہے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو		صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے!!

آمد ہے فصلِ گل کی جو بلبل ہے نغمہ سنج		اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی!!

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال		صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

موجِ گل ڈھونڈھ بخلوت کدۂ غنچۂ باغ		گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے		گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں!

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں		مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

بس کہ ہم ہیں اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے		جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

غالب شناس اور غالب فہم اربابِ ذوق سے درخواست ہے کہ وہ ان اشعار کی توضیح و تشریح ہمیں بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ پسند آنے پر نورِ چشم کا رسالہ سال بھر کے لئے مفت ارسال کیا جائے گا۔ (مدیر)

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن		تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں		مرحبا میں! کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے		کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل		یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ		اے نالہ! نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

خمسہ بر غزل غالب

قبلہ ابو الفصاحت
حضرت جوش ملسیانی

آئے دن غم کی ابتدا کیا ہے — اس مصیبت کی انتہا کیا ہے
ہر گھڑی نالہ و بکا کیا ہے — دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

حسن ہے یا ہے عالمِ اسرار — ایک اقرار اور سو انکار
کون کھولے یہ عقدۂ دشوار — ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!!

ہم بھی الفت کی شان رکھتے ہیں — ہم بھی دنیا میں آن رکھتے ہیں
ہم بھی دل رکھتے جان رکھتے ہیں — ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

عہد کی پھر وہ کر گئے تجدید — دلِ نافہم نے بھی کی تائید
فاقہ مستوں کی دیکھیئے یہ عید — ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

دل پہ جبر اختیار کرتا ہوں — شکرِ پروردگار کرتا ہوں
عشق پر اعتبار کرتا ہوں — جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

نہ سہی کوئی مہ جبین غالب! — نہ سہی کوئی نازنین غالب
نہ سہی حسنِ دل نشین غالب — ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

مزاح

سوانح غالب

از جناب ہری چند اختر

"تنقید حالیہ" کا دور دورہ ہے، اور تحقیق و تدقیق کی سنگلاخ زمین میں نئے نئے پھول اور پودے اُگا کر ویرانے کو گلزار بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اس ضمن میں مصنفوں اور شاعروں کے سوانح حیات ان کے کلام اور تصانیف سے مرتب کرنے کا شغل عام ہو چکا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ حنظل میں عطر نکالنے کی کوشش کے مترادف ہے۔ لیکن لکھنے والوں نے کئی کتابیں لکھ ڈالیں، اور ہم ابھی اظہار رائے کے گنبد سے باہر نہیں آ سکے ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا

ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

پس خاگ از تودہ کلاں بردار پر عمل کرتے ہوئے مرزا غالب پر قلم صاف کرتا ہوں۔ ان کی سوانح حیات بعض حضرات بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد کتابی صورت میں پیش کر چکے ہیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان سطور میں جو کچھ مختصراً پیش کیا جا رہا ہے اُسے پڑھنے کے بعد آپ مصنف کو دعائے مغفرت سے یاد فرمائیں گے۔

غالب کے حالات

نام۔ مرزا کا نام تمام تذکرہ نویسوں نے اسد اللہ خان لکھا ہے۔ چونکہ آپ ایرانی النسل تھے، اس لئے اسد اللہ اور خان کے درمیان بیگ کا لفظ بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن نئے محققوں نے اس نام کے معاملے کو بھی خاص تحقیقات کا مستحق سمجھا اور بڑی کاوش و تلاش کے بعد ثابت کر دکھایا ہے کہ غالب کا نام احمد شاہ ابدالی یا نادر شاہ نہیں، بلکہ اسد اللہ خان تھا۔ ان کے اس انکشاف کی تائید مرزا کے دو شعروں سے ہوتی ہے ؎

مارا زمانے نے اسد اللہ خان تمہیں

وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

مرزا کا تخلص کئی غزلوں میں اسد ہے اور اکثر میں غالب اس سے پڑھے لکھے لوگوں کو شک ہو چلا تھا کہ مرزا کا دیوان دو مختلف شاعروں کے کلام کا مجموعہ ہے لیکن نئے تذکرہ نویسوں نے بزور قلم ثابت کر دیا ہے کہ غالب اور اسد دراصل ایک شخص کے دو تخلص ہیں۔ البتہ ان تذکرہ نگاروں کا خیال درست نہیں کہ مرزا پہلے اسد تھے پھر غالب بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے آخر تک اسد تخلص ترک نہیں کیا، بلکہ مرنے کے بعد بھی سب سے پہلا شعر اسی تخلص سے کہا۔ فرماتے ہیں ؎

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پیدائش

نام اور تخلص کا مسئلہ یوں حل ہو گیا، لیکن مرزا کے سنِ پیدائش اور عمر کے بارے میں نئے اور پرانے تمام تذکرہ نویسوں نے بُری طرح ٹھوکریں کھائی ہیں۔ سب نے غالب کا سنِ پیدائش ۱۲۱۲ھ لکھا ہے اور عمر ۷۳ سال، لیکن یہ صریحاً غلط ہے، مرزا خود کہتے ہیں ؎

تھا تعلیم درس بے خودی ہوں اُس زمانے سے

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا نہ صرف قیس عامری کے زمانے میں زندہ تھے بلکہ عمر میں بھی اسی سے بڑے تھے کیونکہ جناب قیس ایک مبتدی چھوکرے کی حیثیت میں مکتب کی دیواروں پر لام الف لا لکھتا پھرتا تھا، اس وقت مرزا صاحب بے خودی کے پروفیسر مقرر ہو چکے تھے۔ مجنوں کے زمانے میں مرزا کی موجودگی کا ان کے ایک اور شعر سے بھی ثبوت ملتا ہے ؎

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ان دو شعروں کو ملا کر پڑھیں تو یہ شعر ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا غالب قیس عامری سے بہت زیادہ خوبصورت تھے۔ پہلا شعر بتاتا ہے کہ آپ مجنوں سے عمر میں بڑے تھے، لیکن دوسرا شعر کہہ رہا ہے کہ لیلیٰ جو مجنوں کی محبوبہ ہونے کے علاوہ خود بھی اس پر فریفتہ تھی جب مرزا غالب کے سامنے آئی تو مجنوں کو حقیر سمجھنے لگی اور اس حقارت کا کھلے لفظوں میں اظہار کر دیتی تھی۔ مرزا نے اگرچہ اسے اپنی معشوق فریبی کا کرشمہ ظاہر کرنا چاہا ہے۔ لیکن یہ ان کی کسر نفسی ہے، اگر مرزا مجنوں کے مقابلے میں سچ مچ یوسف نہ ہوتے تو لیلیٰ پر ان کی معشوق فریبی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔

والدین

غالب کے باپ کا نام تمام تذکروں میں عبداللہ بیگ درج ہے لیکن مرزا کے کلام سے اس پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ تاہم مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام تھا ضرور۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے ہندوستان میں باپوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ مثلاً جہانگیر کے والد کا نام جلال الدین اکبر تھا اور ہمایوں کے باپ کا نام ظہیر الدین بابر بادشاہ۔ اس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قافیہ کی رعایت سے اسد اللہ کے باپ کا نام عبداللہ تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کوئی قباحت نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن انہوں نے اپنے ایک خط میں شکائت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو بڑھاپے میں ماں کی گالی دی۔ اس سے ثابت ہوا کہ غالب کی کم سے کم ایک ماں ضرور تھی۔

تعلیم

معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی، مجنوں کے زمانے میں کوئی باقاعدہ اسکول اور کالج تو تھا نہیں، صرف ایک دبستان تھا، جس کی دیواریں مجنوں نے لام الف لکھ لکھ کر سیاہ کر ڈالی تھیں۔ اس لئے کسی اور کے وہاں کچھ لکھنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ مجنوں سے پہلے شاید غالب نے بھی یہاں کچھ دن گذارے ہوں، لیکن ظن غالب یہی ہے کہ مرزا گھر پر ہی پڑھتے تھے۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے، اگر ناخواندہ ہوتے تو شعر کیونکر لکھ سکتے اور تنی تصانیف کہاں سے آجاتیں؟ شمس العلما مولوی محمد آزاد نے بھی صرف بہادر شاہ ظفر کے شعروں کو ذوق کی تصنیف بتایا ہے۔ غالب کے بارے میں حسن ظن کا اظہار نہیں کیا۔

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ پس وہ دونوں زبانیں جانتے تھے۔ البتہ اپنی ایک کتاب کا نام "عود ہندی" رکھنے سے ظاہر ہے کہ تحریر و تصنیف میں وہ اردو کو ہندی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مردم شماری کے وقت انہوں نے اپنی مادری زبان ہندی لکھوائی تھی۔

پیشہ اور شغل

مرزا کا سب سے بڑا اور مستقل پیشہ تو عاشقی تھا جس کا ثبوت ان کے دیوانوں میں جابجا ملتا ہے۔ دوسرا شغل یہ تھا کہ شعر چن چن کر رسوا ہوتے رہتے تھے، خود فرماتے ہیں کہ ؎

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے مثلاً انہوں نے مصوری بھی سیکھی تھی فرماتے ہیں ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے!

کچھ مدت یہ شیوہ رہا کہ صبح سویرے ضروریات سے فارغ ہوتے ہی کان پر قلم رکھ کر نکل کھڑے ہوتے اور سارا سارا دن بلا معاوضہ لوگوں کے خطوط لکھتے پھرا کرتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی سوشل سروس لیگ کے ممبر بن گئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ؎

مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مختصر حالات

اب مرزا کے مختصر سوانح حیات سنئیے۔ بخوف طوالت صرف چند واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ جو عام محققوں اور تذکرہ نویسوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔

مرزا کی زندگی اگرچہ عسرت میں گزرتی تھی لیکن اس کے لئے اللہ میاں ذمہ دار نہ تھے۔ خود مرزا کا اقرار ہے کہ خدا نے تو انہیں دونوں جہاں دے دیئے تھے۔ سنئیے ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پھر دونوں جہان گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس دونوں جہان بھی گھر کے ساتھ ہی لٹا دئیے ہوں گے۔ غالب کا گھر نہ صرف ویران تھا بلکہ اس میں ویرانی سی ویرانی تھی۔ چنانچہ ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن یہ گھر وسیع نہ تھا اور مرزا کو ورزش کے لئے یا شاید گیند بلا کھیلنے کے لئے بہت کھلی جگہ کی ضرورت تھی۔ اسلئے جنگل میں جا رہے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

عادات اور خصائل

مرزا بڑے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے، اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے جن کا نتیجہ ان کے حق میں بہت برا ہوتا۔ چنانچہ۔!

ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھے بیٹھے ذرا سی غلطی کے باعث پاسبان سے چند پاپوش کھائیں۔ کہتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ایک مرتبہ خود محبوب کے ہاتھوں بھی پٹے۔ لیکن قصور اپنا بھی تھا۔ اس لئے نہایت ایمانداری سے اعتراف بھی کر لیا کہ ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اس سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف کرکے ایک محرم راز دوست کو رقیب بنا لیا۔ ثبوت ملاحظہ ہو ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

لیکن دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ کبھی کبھی رقیب کو جل بھی دے جاتے ؎

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے بلکہ محبت کے معاملوں میں بھی جوتشیوں سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے اسی لئے کہا ہے ؎

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

غالب کا دل

غالب کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قطرہ یا گوشت کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ آفت کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا اور مرزا اس کی آوارگی کے ہمیشہ شاکی رہتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

لیکن خدا نے فضل کیا اور مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے سوز نہاں کا دورہ ہوا اور سارے کا سارا دل بے محابا جل گیا۔ اس حادثہ جانکاہ کا ذکر مرزا نے یوں کیا ہے ؎

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا۔
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

بدقسمتی سے مرزا کے ناخن بہت جلد بڑھتے تھے چنانچہ زخم ابھی بھرنے بھی نہ پایا تھا کہ ناخنوں کے کھرچے پھر تیز ہو جاتے۔ فرماتے ہیں ؎

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

غالب کا زمانہ

غالب کے زمانے میں دلی میں غم الفت کا قحط پڑ گیا فرماتے ہیں ؎

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں گے کیا

افسوس سارے دیوان میں کہیں وضاحت نہیں کی گئی کہ غم الفت بادشاہ کے توشہ خانے میں موجود تھا یا وہاں بھی جھاڑو پھر گئی تھی۔ نیز یہ کہ راشن کی دکانوں پر کس بھاؤ بکتا تھا۔

البتہ یہ صاف ظاہر ہے کہ مرزا کی خوراک غم الفت تھی یا کم از کم غم الفت ان کی خوراک کا جزو اعظم تھا۔ لیکن اس قحط سالی میں بعض چیزوں کی ارزانی بھی تھی

مثلاً دل اور جان بازار میں بکا کرتے تھے اور ہر شخص جب اور جتنے چاہے خرید سکتا تھا۔ مرزا کو اعتراف ہے ؎

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

غالب کے زمانہ میں پورے سات آسمان تھے۔ آجکل نو آسمان بتائے جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی دو آسمان ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی عہد میں ولایت سے بن کر آئے۔ مرزا کے زمانے کے ساتوں آسمان ایک لحظہ بھی سکون و قیام کی لذت سے آشنا نہ ہوتے۔ بلکہ رات دن لگاتار گھومتے رہتے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس زمانے کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی محبوب کا منہ معلوم نہ ہو سکے اس کی ہیچمدانی کھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا پر بھی یہ گذر گئی۔ اعتراف فرماتے ؎

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

سب سے بڑی قباحت اس عہد کی یہ تھی کہ مجرموں کو سخت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب ایسے شخص کو بھی ایک مرتبہ کسی جرم کی پاداش میں پنجرے میں بند کر دیا گیا لیکن زمانہ اس قدر خراب تھا کہ مرزا اس صورت حال کو بھی غنیمت سمجھتے تھے ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب کا محبوب

مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا۔ اس کا نام سارے جہاں کو معلوم تھا۔ لیکن کبھی کسی شہر اور کسی قصبے میں کوئی شخص اس کا نام ستمگر کہے بغیر نہ لیتا تھا۔ مرزا کہتے ہیں ؎

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہاں میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

اس محبوب کے عادات و خصائل بھی عجیب تھے۔ مثلاً گالیاں بہت دیتا تھا۔ مرزا پوچھتے ہیں ؎

دل گیا بھی ہیں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اس طرح اگر مرزا کبھی شکوہ شکایت کریں تو وہ فوراً اُٹھ بھاگتا اور بسا اوقات سے بارہ ہندرہ دن تک مرزا کے ستے رقیب سے جمع کر لیتا۔ مرزا جھنجھلا کے کہتے ہیں ؎

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

جب کبھی وہ رقیب کی بغل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آ کر پنہاں تبسم کیا کرتا۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

بغل میں غیر کی آپ آج سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں

یہ معشوق تخت، کرسی، مونڈھے یا چارپائی پر بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا ہمیشہ بوریئے پر بیٹھتا تھا اور اگر بوریا نہ ملے تو کھڑے کھڑے چل دیتا۔ مرزا ارشاد فرماتے ہیں کہ ؎

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

یوں بھی وہ اچھا خاصا احمق تھا عشق و محبت کے سیدھے سادھے معاملات بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ مرزا شاکی ہیں کہ ؎

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے!

آخر میں وہ بے طلب بوسے بھی دینے لگا تھا مرزا کی بدگمانی بھری شہادت حاضر ہے ؎

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

معشوق کی صحت اچھی نہ تھی اکثر رعشہ وغیرہ کا شاکی رہتا تھا۔ ایک دن بڑی منتوں کے بعد مرزا کے قتل پر رضامند ہوا۔ لیکن شمشیر سے دو چار کچوکے دینے کے بعد کاری زخم لگانے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ فالج گرا اور بھلا چنگا ہاتھ کستمہ یا کسی ٹانگ بن کے لٹکنے لگا۔ مرزا کی رنج و غم کے مارے چیخ نکل گئی ؎

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم تھا جبھی تو کہا ہے ؎

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا

بین الاقوامی شہرت کے باوجود بے چارے کا گھر گھاٹ کہیں نہ تھا ایک خیمے میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ مرزا فرماتے ہیں ؎

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

لیکن بعض اشعار میں سنگ در پاسبان دیوار وغیرہ کی موجودگی کا قرینہ پایا جاتا ہے ممکن ہے بعد میں اُسے کوئی مکان الاٹ کر دیا گیا ہو۔

چند متفرق واقعات

ایک مرتبہ مرزا نے اُڑنے کی کوشش کی لیکن ہوائی جہاز وغیرہ سے کام نہیں لیا۔ کسی اور طریق سے اُڑے جس کا نسخہ اور ترکیب استعمال وغیرہ سینہ بسینہ اُن تک پہنچ کر اُن کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ بہرحال اُڑے تو سہی لیکن جھٹ جال میں پھنس کر پھڑپھڑانے لگے۔ اسی حال میں لکھتے ہیں ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے کچھ

مدت گھونسلے میں جوں گزاری۔ مرزا کا ایک دربان تھا جب مرزا کا گھر ویران ہوگیا تو اس کے لئے کوئی کام نہ رہا مگر اس نے مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھاس کھود کر گذر اوقات کرتا رہا۔ مرزا فرماتے ہیں ؎

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

غالب نے کئی مرتبہ بہشت کی سیر بھی کی ایک مرتبہ وہاں سے واپس آئے تو محبوب سے کہنے لگے ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

خواجہ خضرؑ سے بھی اکثر ان کی ملاقاتیں ہوئیں نصرت الملک کے قصیدے میں ارشاد ہوتا ہے ؎

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات کا ہے

لیکن دوسرے مصرعے میں شرف کا لفظ دوستانہ مروت کے مارے استعمال کیا ہے۔ ورنہ دراصل وہ خضر کی رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ ثبوت حاضر ہے ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

مرزا بزدل بھی تھے۔ ایک مرتبہ سڑک پر راہزن کا سامنا ہوگیا تو اسے دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگ نکلے۔ لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود پکڑے گئے اب ستم ظریف لٹھ مارنے ڈانٹ کر کہا۔ "کم بخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے۔ اب ذرا پاؤں دابئے۔" اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ملی
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا اپنے رقیب کے دروازے پر ایک کم نہ ایک زیادہ پورے ہزار مرتبہ گئے۔ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی اتنی ہی مرتبہ وہاں گیا ؎

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

کچھ مدت مرزا کی عسرت نے یہ شدت اختیار کر رکھی کہ بے چارے دلی کی گلیوں میں بالکل ننگ دھڑنگ پھرتے رہے۔ ایک دن اسی حالت میں بادشاہ کے دربار میں پہنچے اور بہادر شاہ ظفر سے شکوہ کیا ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھائے اُدھار

اس پر بادشاہ نے آپ کو ایک بہت بڑا کرتا سلوا دیا جس کا دامن اتنا بڑا تھا کہ اس کا ایک سرا دھونے میں پورا دریا خشک ہوگیا۔ اس پر ارشاد ہوا ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا!

نوٹ:۔ اس زمانے میں دریائے جمنا کا نام معاصی تھا اور مرزا وہیں کپڑے دھونے جایا کرتے تھے۔

دریائے جمنا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سورگ لوک میں بہتا تھا دوسری رام داچندر جی کے ایک بزرگ مہاراجہ بھاگیرتھ تپسیا کے زور سے اسے زمین پر لائے تھے۔ اب دریائے جمنا کے ظہور کا حال مرزا جی سے سُن لیجئے کہتے ہیں کہ میری وحشت کے لئے عرصۂ آفاق بھی تنگ ہوگیا تو زمین کو بڑی شرم آئی۔ حتیٰ کہ اس کی پیشانی پر بڑے زور کا پسینہ آگیا بس وہی دریا بن گیا ؎

وحشت یہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے
دریا زمین کو عرق انفعال ہے

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ جب کبھی مرزا کو دربار پر ڈانٹ ڈپٹ ہوتی تو وہ کعبہ کی جانب چل دیتے کہتے ہے ؎

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ کو ہو آئے

اس طرح آئے دن محبوب کے گھر اور کعبہ اللہ جانے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں کعبہ، دہلی اور مکہ کا درمیانی فاصلہ بھی بڑھ گیا یا پھر مرزا کو کوئی بہت تیز رفتار سواری

(صفحہ ۲۹ پر)

مرثیۂ غالب

از سر ڈاکٹر اقبال رح

"تیری ہمسری ممکن نہیں"

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!
تھا سراپا روح تو بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں!
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشین
ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستان کی سرزمین
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بین!

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

بڑے بڑے صوفیائے کرام اور مُفتی لوگوں نے غزل کی لاج رکھنے کے لئے شرابِ معرفت کے چھینٹے لگائے ہیں۔ رندِ مشرب غالب بھی ان میں پیش پیش ہیں۔ خمریات کے اجزائے ترکیبی میں ضروری عناصر شراب، ساقی، پیرِ مغاں، جام و مینا، سرشاری و مستی وغیرہ ہیں مگر شعرا نے اپنے ذوق کے مطابق ان کو الگ الگ معنی میں استعمال کیا ہے۔ کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جنہیں شغلِ مے نوشی سے ذرا بھی لگاؤ نہیں رہا مگر اُن کا کلام ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے مثلاً ریاض خیرآبادی نے جن کو خمریات کا بادشاہ کہا جاتا ہے اپنی زندگی میں ایک بوند شراب ہونٹوں سے نہیں لگائی۔ لیکن دوسری طرف غالب اور داغ جیسے رندِ مشرب شاعر بھی موجود ہیں جن کی شاعری کا تمام تر انحصار و ولولہ اسی شرابِ کہن کی بدولت ہے۔ حضرتِ جگر بھی انہی شعرا میں ہیں جنکے اشعار میں خلوص و تاثر ہے جنہوں نے شراب کے نشہ میں ڈوب کر اشعار کہے ہیں۔ ذیل میں مرزا کے خمر و خمار سے متعلق بعض منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام حظ اٹھا سکیں۔ (مُدیر)

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

قرض کی پیتے تھے مے دل میں سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو!

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں!

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب — دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

مے پرستاں! خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے — ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب — تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار ‏ رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

صرف بہائے مے ہوئے آلات مے کشی ‏ تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے ‏ غلام ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

کل کے لئے کر آج نہ خستِ شراب میں ‏ یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب ‏ اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مینائے مے ہے سرو نشاط بہار سے ‏ بالِ تدرو جلوۂ موج شراب ہے

غالب کا فلسفہ

از شیخ محمد اکرام صاحب
ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ سی۔ اے۔ ایس
آئی۔ سی۔ ایس

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کیا غالب ایک فلسفی تھا؟

عشقیہ شاعری کے علاوہ ایک دلچسپ مسئلہ غالب کے فلسفہ کا ہے۔ غالب کے مداح مصر ہیں کہ وہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا اور اگر فلسفہ سے دقیق اور غور طلب خیالات کا اجتماع مراد لیا جائے تو اس دعوے سے بہت کم لوگ اختلاف کریں گے۔ لیکن اگر کسی شاعر کے فلسفے سے اس کا انسانی زندگی یا اس کے کسی اہم پہلو کے متعلق کوئی خاص شخصی نقطۂ نظر مراد ہے تو آج تک یہ دعویٰ ثبوت کا محتاج رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک غزل گو کی شاعری کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ جب تک وہ اقبال کی طرح اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی خاص کوشش نہ کرے یا خیام اور حافظ کی طرح ایک ہی نشے میں مست نہ ہے۔ اس کے کلام میں چند خیالات کی تکرار کے بجائے مختلف النوع خیالات کا ہجوم ہوتا ہے چنانچہ غالب کے فلسفے کے متعلق کوئی بھی نظریہ قائم کیا جائے۔ اس کی تردید کے لئے غالب کے کلام سے بیسوں اشعار مل جائیں گے۔

غزل کی خصوصیت کے علاوہ مرزا کا دل ایک ایسا جام جہاں نما ہے جس میں ایک ہی نقشہ ہمیشہ نظر نہیں آتا بلکہ فطرت کے تمام نقوش باری باری سے نمایاں ہیں۔ مرزا غالب کو خدا نے نگہِ ژرف بین عطا کی تھی اور ان کے ابتدائی دور میں بھی غور طلب اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ جب اس کے بعد مرزا نے اپنے ذہن بیدار کو طوطا مینا بنانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی دلی کیفیتیں اور

حجاب انسانی کی کشمکش بیان کرنے کے لئے استعمال کیا۔ تو ان کے اشعار میں فلسفیانہ خیالات کثرت سے آگئے لیکن چونکہ مرزا کا مقصد کسی خاص فلسفہ کی ترجمانی نہ تھا۔ محض دل پر گذری ہوئی کیفیتوں کا اظہار مطلوب تھا۔ اس لئے شاعری کی مزاجی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان خیالات کا رنگ بھی بدلتا رہا۔ کبھی ان میں رنج و الم کا بیان زیادہ ہوتا اور کبھی تسلیم و رضا کا کبھی ان میں تشکک کے مضامین کثرت سے آتے اور کبھی شوخی اور تفنن طبع کے یہ صحیح ہے کہ اس اختلاف کے باوجود ان اشعار میں مرزا کی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہیں۔ لیکن یہ شخصیت جامد نہ تھی۔ حالات کے ساتھ بدلتی اور ترقی کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کا اظہار مختلف وقتوں میں مختلف صورتوں میں ہوا ہے۔ اور ان سے ایک معین فلسفہ ترتیب نہیں دیا جا سکتا۔ مرزا کا کلام ایک آئینہ ہے۔ جس میں فطرت کے تمام عکس اس طرح آرہے ہیں کہ ایک تصویر دوسری تصویر سے مختلف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ چند نقوش پر پردہ ڈالنے اور ایک آدھ کو نمایاں کرنے سے ایک تصویر بنائی جا سکے۔ جسے خوش فہم حضرات غالب کا فلسفۂ زندگی یا اس شاعرانہ پیغام سمجھ لیں۔ لیکن آخر اس کوشش سے فائدہ؟

کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شاعر کوئی خاص پیغام یا معین فلسفۂ زندگی چھوڑ جائے؟ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک ایک شاعر کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ اپنے

خیالات اور جذبات کا نچوڑ رباعیوں اور قطعوں کی صورت میں ان کے حوالے کرتے۔ تاکہ وہ انہیں دیواروں پر لگائیں۔ اور روزمرہ زندگی میں اپنے لیے چراغِ راہ بنائیں۔ ان خوش نصیب لوگوں کی طبیعتیں سدھائے ہوئے گھوڑوں کی طرح ہیں۔ جنہیں باگ کے اشارے سے جس طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ لیکن عام لوگ اس قدر خوش قسمت نہیں۔ اور نہ ہی انسانی زندگی میں کوئی اہم انقلاب اتنی آسانی سے ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے کہ شاعر کا کام عقائد کو بدلنا نہیں بلکہ تخیل کی طرح صحیح تربیت اور ضیافتِ دل و دماغ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے جو ذاتی احساسات اور مشاہدات کا عطیہ ہیں اگر ان کا نچوڑ حقائق اور فلسفے کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک تخیل کی نشو و نما اور تربیت اس شعوری بلندی تک نہ ہو گئی ہو۔

ایک بلند مرتبہ شاعر جو انسانی فطرت کا بھی صحیح نباض ہوتا ہے۔ اس لطیف نکتے سے بے خبر نہیں کہ انسانی زندگی کے ارتقائی دور میں انسان کے عقائد اور اس کے تخیل میں اکثر ایک خفیف سا تضاد ہوتا ہے اور اگر فلسفۂ زندگی اور پیغام سے ایک شخص کے عقائد بدل دیئے جائیں لیکن اس دنیائے تخیل یا نفس غیر شعور اسی طرح رہے۔ تو یہ تضاد اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی فطرت ان بلندیوں تک نہیں پہنچتی ہے۔ جن کے حاصل کرنے کے لئے بہترین شاعری مفید ہو سکتی ہے۔

وہ ایک شراب خور کو دیکھتا ہے جسے خواری کے نقائص سمجھا دیئے گئے ہیں۔ جو اسے ترک کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہو گیا ہے کہ شراب خوری بری عادت ہے۔ لیکن اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کے ذہن کی گہرائیوں میں ایک شراب خوری کے خیالات موجزن رہتے ہیں۔ وہ پرہیزگاری کا فلسفہ خوب سمجھتا ہے۔ لیکن اس کی دنیائے تخیل ایک شراب خور کی ہے۔ اب انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس حالت میں شراب خوری کے خلاف جس قدر دلیلیں اس کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ ان سے اس کی باطنی کشمکش میں اضافہ تو ہو گا۔ لیکن جب تک اس کی دنیائے تخیل ہی کو نہ بدلا جائے یا زمانے کا سرد گرم چکھنے سے اس کے عقائد اور احساسات میں ایک طرح کا توازن نہ آ جائے۔ وہ اس گڑھے سے باہر نہ نکل سکے گا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ ایک آدمی فلسفۂ عمل کا بہت معتقد ہے۔ صبح و شام اسرارِ خودی اور درسِ حیات کی تلاوت کرتا رہتا ہو۔ لیکن جب عمل کا وقت آئے تو تخیل اس کا ساتھ نہ دے بلکہ اس کی مخالفت کرے اور اس کے ذہن کی گہرائیوں سے فقط ایسے احساسات اور خیالات پیدا ہوں۔ جن سے عمل غیر ضروری بلکہ مضر معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر تخیل کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تو اس فلسفۂ عمل سے ایک ذہنی کشمکش کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو گا اور بقولِ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ؎

برقے کہ بخود پیچد بردہ بہ سحاب اندر

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کا معیار انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے لیکن اس اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی معین فلسفۂ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے معین فلسفوں کو نہیں چھوا۔ لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور روح کی نشو و نما کا ایسا سامان چھوڑا ہے جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب ہوتا ہے۔ شیکسپیئر اور غالب دونوں اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں نے زندگی کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کیونکہ ایک پہلو پر زیادہ زور دو تو وہ دوسرے جیسے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں لیکن صرف ظاہر بین ہی کہیں گے

کہ انہوں نے انسانی زندگی کو متاثر نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی معیّن فلسفہ دنیا کے لئے یادگار نہیں چھوڑا۔ لیکن انسانی تخیل کی صحیح تربیت اور انسانی فطرت کے ارتقاء کے لئے ان کا کلام اسی طرح مُفید ہے۔ جس طرح ایک عظیم اور بلند مرتبہ شخصیت کا فیضِ صحبت!

ایک بڑا شاعر خود ایک عظیم الشان شخصیت کا حامل ہوتا ہے اور اپنے کلام سے جو اس کی شخصیت کی انتہائی گہرائیوں کا اظہار ہے۔ اپنی شخصیت کا پَرتَو ناظرین کے دل و دماغ پر ڈالتا ہے۔ اور نہایت لطیف طریقے سے ناظرین کی تخیلی زندگی بھی اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ جو شاعر کے تخیل میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا تخیل شاعر کی دنیائے تخیل سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اور جس طرح ڈرامہ (مثلاً یونانی ٹریجڈی) میں ہیرو کے کارنامے نمایاں دیکھنے اور دنیائے تخیل میں اُس کی طرح محسوس کرتے ہیں ہم بھی ایک لطیف طریقے سے ہیرو کی خصوصیات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک شاعر کا مطالعہ مستقل اور گہرا ہو۔ یہ تاثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے کلام غالب کے مطالعہ سے ہم پر غالب کی ایک عظیم شخصیت کا پرتو پڑتا ہے اور اگرچہ یہ اثر اس طرح واضح اور نمایاں نہیں، جس طرح دلائل و براہین سے عقائد کا بدلنا۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔ تخیل اور روح کی تربیت، عقائد کی شعوری تبدیلیوں سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ اور شاعری کی یہی اہم خصوصیت ہے، جس کی طرف غالب نے اشارہ کیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار
زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں
خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

حُزنیاتِ غالب:۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ غالب کو فلسفی ثابت کرنے کے متعلق آج تک جو کوششیں ہوئی ہیں وہ اکثر ناکام رہی ہیں۔ ان کے علاوہ آپکی اُفتادِ طبع اور اس کی ذہنیت کے متعلق بھی کئی مضامین لکھے گئے ہیں۔ اور چونکہ علامہ اقبالؒ کے کلام کی وجہ سے اس وقت رجائی اور قنوطی فلسفوں کا اختلاف ملک کے سامنے بہت نمایاں ہے اس لئے غالب کے متعلق بھی چند مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں کہ خواہ غالب کسی خاص اسکول کا فلسفی نہ ہو۔ آخر اس کی طبیعت پر رجائی اور قنوطی کون سا رنگ غالب تھا؟

مولینا نیاز فتحپوری نے ایک طویل مضمون میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا تو وہ فلسفہ تفاؤل و مسرت تھا۔ لیکن جمہور بالعموم اس امر پر متفق ہیں کہ غالب کے اشعار میں غم و حزن کی جھلک مسرت و اطمینان سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غالب میں کئی جگہ تو غم کا بیان بیشتر خیال آرائی اور زورِ طبع یا تخیل کی شوخی دکھانے کا ذریعہ ہے۔ مثلاً

ہفت آسمان بگردش و ما درمیان او
غالب دگر مپرس کہ برما چہ میرود !

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو، پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
دائم کو دختند زمیں را بہ آسمان
آں گونہ دادہ اند مرا در میان فشار
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیکن غالب کا تمام کلام پڑھنے کے بعد دل پر جو اثر باقی رہتا ہے۔ وہ کسی حد تک اُس مایوسی اور افسردگی کا ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے خود ایک شعر میں کیا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حقیقت یہ ہے کہ مرزا ان بے اندازہ خواہشوں
اور ارمانوں سے بھرا ہوا دل لائے تھے جن کا پورا
ہونا بہت مشکل تھا۔ ؎

نامرادم داد این افسردگی خواہش بہ دہر
آب بر من بستہ اند آرے ز استسقائے من

اس کے علاوہ طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب ان
کی خواہشات پوری نہیں ہوتی اور مایوسی اور بے اطمینانی
کا علاج کامیابی و کامرانی سے نہیں ہوتا تو جس طرح
شراب پینے والے خمار اور اعصاب شکنی کو دور کرنے
کے لئے اور شراب پی لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی اپنی
خواہشوں کو بڑھا کر عارضی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔
بقولِ غالب ؎

ہرچہ از سرمایہ کاست در ہوس افزودہ ایم
نشاطِ خاطرِ مفلس نہ کیمیا طلبی است

لیکن جب خواہشیں اور امیدیں اس قدر زیادہ
ہوں گی۔ مایوسی کی حالتیں بھی اسی کثرت سے ہوں گی

ہر گونہ حسرتے کہ ز ایام مے کشیم
دُردِ تہِ پیالۂ امید بودہ است

یہی وجہ ہے کہ مرزا کے کئی اشعار میں مایوسی اور
افسردگی کا رنگ غالب ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی درست
ہے کہ اگرچہ مرزا کی زندگی ایک ناکام زندگی نہیں لیکن
ان کی قسمت میں مصائب کا حصہ بھی بہت تھا۔ دو برس
کے تھے کہ باپ نے وفات پائی، پانچ برس کے ہوئے تو چچا
مر گئے۔ اس کے بعد وہ بے فکر عیش و عشرت میں چلے لیکن
اس چند روزہ عیش و عشرت کا خمیازہ بہت بھگتنا پڑا۔
قرضخواہوں کے پیچھے سے انہیں عمر بھر نجات نہ ملی۔ زندگی
کے بہترین سال جاگیر کی تگ و دو میں گزارے جس کا نتیجہ ناکامی
اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ تیس برس کی عمر میں بھائی
کی دیوانگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ جب ذرا سنبھلے
تو کوئی اور چرکا لگ جاتا۔ پچاس سال کی عمر میں قمار با
کے جرم میں جیل جانا پڑا۔ بادشاہ کے استاد ہوئے۔ باد
کے استاد ہوئے تو دو ہی سال میں ؎

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

جب مرزا کو ان ناساعد حالات سے سابقہ پڑا
تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کے اشعار میں غم کا
غالب ہے۔ لیکن غم کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور ان میں
فرق ہوتا ہے۔ ایک غم حالی کا ہے۔ جس سے بیتاب ہو
شاعر اپنے گرد و نواح کی دنیا ہی بدل دیتا ہے۔ دوس
غم میر تقی میر کا غم ہے۔ جو ذاتی بے چینی اور باطنی کشمک
کا اظہار ہے اور جس میں حساس اور زود رنج انسا
غم سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے کہ اگر اسے دور کر
کی کوشش کی جائے تو وہ اور بے چین ہوتا ہے۔
غالب کا غم نہ تو حالی کا غم ہے۔ جس پر دنیا کی س
خوشیاں نثار ہونی چاہئیں۔ اور میر تقی میر کا غم، جو
مستقل طور پر ہے تو ایک طرح کی دماغی بیماری ہے
کا غم اس صحت مند آدمی کا حزن و ملال ہے جسے دنیا کی
چیزوں سے محبت ہے لیکن وہ مسلسل سعی کے باوجود
حاصل نہیں کر سکتا تو غمگین ہو جاتا ہے۔ غالب کے
میں حزن و افسردگی کی جھلک ہے لیکن غالب کی اف
عام قنوطیوں کی طرح دنیا کی مذمت کے باعث نہیں
دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے۔
کی انتہائی مایوسی میں بھی ترک دنیا، رہبانیت یا مردم
کا شائبہ تک نہیں، بلکہ یہ حزن و افسردگی اس آدمی
جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے اور جسے اس سے
رہنا ناگوار ہے۔ وہ خود ایک فارسی قصیدے میں کہ

شاہا اگر ز درد نہ نالم بدیں نمط
اندوہ چگونہ از دلِ مضطر بر آوردم
نے پائے آنکہ از سرِ راحت تواں گذشت
نے جائے آنکہ خار ز بستر بر آوردم

اس کے علاوہ ہمیں مرزا کی مردانگی کی داد دینی چاہیئے کہ اگرچہ اشعار میں جوان کے جذبات کا آئینہ ہیں مایوسی اور اطمینانی صاف ٹپک پڑتی ہے لیکن عملی زندگی میں انہوں نے غم کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور میر تقی میر کی طرح پژمردگی اور غم کو خوش طبعی اور زندہ دلی پر غالب نہیں آنے دیا ہے

پیرم مگر بہ طبع جواناں گراں نیم
خوں خورد دم نہفتہ دمے خوردن آشکار

عرفانیاتِ غالب

انسان جب کسی چیز کی خواہش کرتا ہے اور اسے نہیں پاتا تو اس کی مایوسی قدرتی امر ہے خواہ یہ ناکامی خواہشات کی فراوانی سے ہو یا نامساعد اتفاقات سے لیکن زندگی میں مسلسل اضطرار اور بے چینی نہیں ہو سکتی۔ عام طور پر مایوس اور ناکام لوگ اپنی ناکامیوں کو قضا و قدر کے سر پر ڈال کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مقدر کا قصور ہے۔ مرزا کی غمزدہ طبیعت نے بھی ایک طرح کا سکون اور توازن حاصل کر لیا تھا۔ لیکن رسمی طور پر قسمت کو ملزم قرار دیکر نہیں۔ بلکہ نگاہِ ژرف بین کی مدد سے جو ان کی اپنی ناکامیوں سے آگاہ تھی۔ تو دوسروں کی ناکامیاں اور مایوسیاں بھی اس سے پنہاں نہ تھیں۔ انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ زمانے کی ترکش میں ہزاروں تیر ہیں۔ ایک سے ایک زہریلا اور ان سے کوئی محفوظ نہیں تو طبیعت میں ایک طرح کا سکون آجاتا ہے۔ غالب کے کئی اشعار میں اس خیال کا اظہار ہے ؎

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

ستاہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

علاوہ ازیں مرزا نے زندگی کے انقلاب دیکھے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر خوشی محدود اور قلیل الفرصت ہے تو بھی غیر محدود یا غیر فانی ہے ؎

بیا کہ نیست ثباتے بدیں نشاط و ملال
بیا کہ نیست دوامے بدیں بیاض و سواد

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یکدگر اند
روزِ روشن بہ وداعِ شبِ تار آمد و رفت

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
ہم خزاں ہم بہار در گزر است

اسی طرح انسانی فطرت ہی کچھ اس طرح پابند اور مجبور واقع ہوئی ہے کہ غم کی باگ بہت ڈھیلی چھوڑی نہیں جا سکتی ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جب ان کے عزیز شاگرد میر گوپال تفتہ ترک دنیا پر آمادہ ہوئے تو مرزا نے ایک خط لکھا ہے جس میں انسانی فطرت کی ان مجبوریوں کا ذکر کر کے ان کو نہایت صائب مشورہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"کیوں ترک لباس کرتے ہو۔ پہننے کو تمہارے پاس کیا ہے جس کو اتار کر پھینکو گے۔ ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پئے گزارا نہ ہوگا۔ سختی و سستی و رنج و آلام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو اسی صورت بہر صورت گذرنے دو۔"

ایک اور خط میں انہوں نے خود اس عملی رواقیت کی مثال قائم کی ہے۔ مرزا نے تفتہ کو لکھا ہے:۔

"مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیتے جاتا ہوں، باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں، جب موت آئے گی مر رہوں گا

نہ شکر ہے نہ شکایت، جو تقریر ہے۔ بہ سبیل حکایت۔"

اس طرح کے اندراجات مرزا کے خطوط میں کثرت سے ہیں۔ ان خطوط کا اکثر حصہ غدر کے بعد لکھا گیا اور ان میں وہ مصائب جو مرزا یا ان کے عزیز دوستوں اور عام طور پر اہل دہلی کو برداشت کرنی پڑیں۔ بیان ہوئی ہیں۔ لیکن قاعدہ ہے سے

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ان خطوط میں غم والم کا بیان ہونے کے باوجود سکون، صبر اور رضا وتسلیم کا اظہار کثرت سے ہے۔ بلکہ اگر غالب کے ان خطوط کا ان اشعار سے مقابلہ کریں جو مرزا نے سفر کلکتہ کے دوران میں لکھے۔ وہ عارفانہ رنگ جو مرزا پر دور آخر میں غالب آگیا تھا، نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ایک مضمون میں مرزا کی اردو شاعری کے متعلق لکھا تھا۔

"لیکن ان کے کلام کی اصلی خوبیاں اور محاسن ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوئے۔ غالب مغلیہ سلطنت اور اس کے آئین کی مکمل تباہی سے بیحد متاثر ہوئے اور اسی تاثر نے ان کی شاعری پر دلگدازی اور رقت کا وہ رنگ چڑھا دیا جو اس میں جدت اور طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مولوی صاحب نے مرزا کے کس اردو کلام کی نسبت یہ رائے قائم کی ہے غدر کے بعد مرزا نے معدودے چند اردو غزلیں لکھی ہیں اور ان میں دلگدازی اور رقت کے بجائے شوخی اور لطف طبع کا رنگ زیادہ نمایاں ہے سے

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرت ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

اردو کے معلّی میں فقط ایک اردو قطعہ ہے جو اس زمانے میں لکھا گیا جب مارشل لا کی پابندیاں ابھی قائم تھیں اور مرزا نے اس قطعہ اور ایک اردو شعر میں ان پابندیوں کا تذکرہ رنج وافسوس سے کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دس اشعار کی بنا پر جو ایک خاص واقعہ کے متعلق ہوں۔ ایک دور کی عام شاعری کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غدر اور مابعد الغدر کی مصیبتوں سے مرزا پر جو رنگ غالب آیا۔ وہ بے قراری اور بے چینی کا نہ تھا بلکہ سکون وقرار کا تھا۔ مرزا نے "قلزم خون میں شناوری" کی تھی۔ قیامت حقیقی تو خیر کس نے دیکھی ہے۔ لیکن مرزا نے اپنی آنکھوں سے دہلی کا سارا انتظام روز حشر کی طرح تہہ وبالا ہوتے دیکھا تھا۔ اور ان مصیبتوں سے دوچار ہوئے تھے۔ جنہیں قیامت صغریٰ کہنا کسی طرح مبالغہ نہیں۔ مرزا کے خطوط میں ان مصائب کی پُر اسرار روئیداد بہ طریق حکایت درج ہے اور وہ ان سے بڑے متاثر ہوئے۔ بالآخر ان کی حکیمانہ طبیعت، ان کے غم والم پر غالب آگئی۔ انہوں نے زندگی کے تیرہ وتار حقیقتوں کو عریاں دیکھا تھا لیکن اب وہ ان سے بیقرار نہ ہوتے بلکہ ایک راضی برضا عارف کی طرح نیرنگئی قدرت کا تماشہ دیکھتے سے

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

تفتہ کے نام انہوں نے جو تسلی وتسکین کے خطوط لکھے ہیں۔ وہ ان کے اس زمانے کے خیالات کا آئینہ ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی کئی خطوط ہیں جن میں تسلیم ورضا کا سبق ملتا ہے۔ ایک خط میں صاحب عالم کو لکھتے ہیں:۔

"پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام ونشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ بھی ہوا چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے۔ اس کا گلہ کیا سے

چوں جنبش سپہر بفرمان داور ست
بیداد نبود آنچہ با آسمان دہد

یہ تحریر بطریق حکایت ہے۔ نہ بہ سبیل شکایت۔"

ایک اور خط میں منشی بدر الدین کو مشورہ دیتے ہیں:-

"قضا و قدر پر چھوڑ دو۔ نیرنگئ قدرت کے تماشائی رہو"

اسی اصول پر مرزا کا اپنا عمل تھا۔ غدر کے بعد جو حالات بدل گئے تھے۔ ان کی نسبت ایک خط لکھتے ہیں:-

"نہ وہ احکام ہیں، جن کو میں جانتا تھا نہ وہ عملہ ہے، جس کی میری ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگئ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔"

میر مہدی حسین مجروح نے انہیں کسی خط میں صبر و تسلیم کا مشورہ دیا۔ مرزا کو یہ مشورہ برا معلوم ہوا۔ کیونکہ وہ اپنے تئیں شیوۂ تسلیم و رضا بہترین ترجمان سمجھتے تھے۔ میر مجروح کو لکھتے ہیں:-

"میری جان تو یہ کیا کہہ رہا ہے، بیٹے سے سیانا، سو دیوانا۔ صبر و تسلیم، توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون سمجھے گا۔ جو تم کو سمجھاتے ہو؟" اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"چپکے ہو رہو۔ اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین و مضطر گمان نہ کرو۔" اور ایک خط میں نواب ضیاء الدین کے صاحبزادے شہاب الدین احمد خان کو لکھتے ہیں۔ (فروری ۱۸۶۵ء)

"صبر کرو اور چپ رہو۔"

بر دل تنفس اندہ گیتی بسر آید

گیرند کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

غرضیکہ غالب کی نظم و نثر میں زندگی کے دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ اس میں حزن و ملال کا اظہار بھی ہے اور سکون و قرار کا پیغام بھی مرزا کو رجائی یا قنوطی کسی ایک طبقے سے منسلک کرنا قرین انصاف نہیں۔

ایک غزل گو شاعر کے کلام میں اس کا پیغام اس طرح ساری پریشان ہوتا ہے۔ جس طرح ایک پھول کے فضا میں اس کی خوشبو اس کی تعیین بہت مشکل ہے۔ اور بالخصوص اپنے شاعر کا پیغام ڈھونڈنا جس نے کسی ایک خاص طبقے کی ترجمانی کی ہو۔ اور بھی دشوار ہے۔ لیکن مرزا کے رنگ طبیعت کا بہترین اظہار شاید ان فارسی اشعار میں ہے جنہیں ہم نے معانی غالب میں زندگی کے عنوان سے منتخب کیا ہے اور جن میں مرزا کے فلسفۂ حزنیہ اور رجائی دونوں پہلوؤں کی خوشگوار آمیزش ہو گئی ہے؎

تو نانی از خلد خارد ننگری کہ سپہر

سر حسین علی بر سنان بگرداند

بود بشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا

جو قدر بر خط امتحان بگرداند!

یزید را بہ بساط خلیفہ بنشاند

کلیم را بہ لباس شبان بگرداند

غالب کا فلسفہ صفحہ نمبر ۱۹ سے آگے

مل گئی ہوگی۔ مرزا نے مرنے کے بعد بہت شعر کہے اور کسی کسی طرح اپنے شاگردوں کو بھی پہنچائے۔ انہوں نے دیوان میں شامل کر دئے؎

"جس شخص کی کوشش سے چھپے میرے بعد" یہ سارا غزل مرنے کے بعد لکھی۔ اس سے قبل کے دو شعر اور حاضر ہیں؎

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ ٭ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

آنکھ سے داغ حسرت دل کا شمار یاد ٭ مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

مجنون عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی، اس کا انتقال بھی ان سے پہلے ہوا۔ مرزا کہتے ہیں؎

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد

مجنوں جو مر گیا تو جنگل اداس ہے

مرزا بے چارے کی موت بھی غریب الوطنی میں ہوئی۔ فرماتے ہیں؎

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور ٭ رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

موت یوں ہوئی کہ آخر عمر میں دمہ کے دورے پڑنے لگے تھے ایک دن اسی حالت میں سر پھوڑ کر مر گئے۔ مرتے مرتے ارشاد ہوا؎

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے ٭ بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

معشوق کو یہ حال معلوم ہوا تو مروت نے جوش مارا اور دوڑا آیا لیکن مرزا غریب میں ایک نظر دیکھ لینے کی بھی سکت نہ رہی تھی چنانچہ شعر پڑھتے پڑھتے جان بحق ہو گئے؎ ہو گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے

خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

{نوری جیم کے خاص غالب نمبر کے لئے غالب کی زمین میں ایک غزل ہے}——!

نذرِ غالب

جناب علامہ احمد خاں قیس

ہے تو نغمہ سکوتِ پردہ ساز
کون سمجھے مگر تری آواز ؟

لذتِ صبر سے کھلا یہ راز
حسن بھی عشق کا ہے اک اعجاز

آپ کی یاد بھی ہے اک اعجاز
جھک گئی خود بخود جبینِ نیاز

وہ مقام اب ہے فرشِ پا انداز
جس جگہ جل اٹھے پرِ پرواز

لبِ خنداں ہے وقفِ آہ و فغاں
اف یہ انجام! آہ، وہ آغاز

فرق پست و بلند میں نہ رہا
دل نے دیکھے ہیں وہ نشیب و فراز

شور ہو، نوحہ ہو، ترانہ ہو
سب ہیں اپنی جگہ نوا پرداز

کون سمجھے رموزِ حسن و عشق
ناز بھی راز ہے نیاز بھی راز

عہد تو نے بدل دئے کیا کیا
کعبہ و سومنات کے انداز

عشق ہے اس مقامِ خاص پر اب
غزنوی ہے جہاں نہ کوئی ایاز

قیس! اغماض بھی ہے جب دل کش
کیوں نہ ہو التفاتِ روح نواز؟

گُل افشانیٔ گفتار

{غالب کے لطیفے}

جناب راجیش گوہر

مرزا ہر جگہ اپنی شوخی و ظرافت سے کام لیکر ایسی بات کہہ دیتے تھے جو سننے والے کی دلچسپی کا سبب بن جاتی تھی اور لوگ اُس سے لُطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ جناب راجیش گوہر نے بڑی کدو کاوش کے بعد مرزا سے متعلق یہ لطائف و ظرائف فراہم کئے ہیں جنھیں شکریہ کے ساتھ نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔

(ایڈیٹر)

ایک رات مرزا کے ایک دوست سیّد مرزا غالب سے ملنے کے لئے اُن کے مکان پر آئے۔ جب وہ جانے لگے تو مرزا خود شمع لیکر اُن کے ساتھ آئے تاکہ وُہ روشنی میں اپنا جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ سیّد مرزا نے کہا: "قبلہ! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں خود ہی جوتا پہن لیتا۔" مرزا نے کہا: "میں شمع آپ کو جوتا دکھانے نہیں لایا بلکہ اس لئے کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

ایک صحبت میں ذوقؔ اور دوسرے شعرا موجود تھے۔ مرزا نے میر تقی میرؔ کے کلام کی تعریف کی۔ ذوقؔ نے کہا کہ سوداؔ کا کلام میرؔ کے کلام سے بہتر ہے۔ مرزاؔ نے کہا۔ میں تو آپ کو "میری" سمجھتا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ آپ "سودائی" ہیں۔

ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ گزرنے کے بعد مرزاؔ بادشاہ سے ملنے آئے۔ بادشاہ نے دریافت کیا۔ مرزاؔ تم نے کتنے روزے رکھے؟ مرزاؔ نے جواب دیا: "پیر و مُرشد" ایک نہیں رکھا (یعنی یا تو ایک نہیں رکھا یا کوئی نہیں)۔

شاید اسی موقع پر ذیل کا قطعہ دربار شاہی میں پڑھا گیا ؎

افطارِ صوم کی اگر کچھ دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

کسی نے مرزاؔ سے پوچھا: "رتھ مذکر ہے یا مؤنث؟" تو انہوں نے جھٹ سے فرمایا: "اگر رتھ میں عورتیں بیٹھی ہیں تو مؤنث اور اگر مرد بیٹھے ہوں تو مذکر سمجھا جائے۔"

ایک دن مرزا پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ میر مہدی نے پاؤں دبانے شروع کئے۔ مرزاؔ نے ہر چند منع کیا۔ لیکن میرؔ نہ مانے بلکہ کہنے لگے: "اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو اُجرت دے دیجئے گا۔" مرزاؔ راضی ہو گئے۔ جب میر مہدی پاؤں داب چکے تو اُجرت طلب کی۔ مرزاؔ نے کہا: "بھیا! کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے۔ میں نے تمہارے پیسے دابے۔ حساب برابر ہو گیا۔"

ایک مرتبہ مرزا۔ بہادر شاہ ظفر کے ہمراہ مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ چاروں طرف رنگ برنگے آموں سے لدے ہوئے درخت بھی بہار دکھا رہے تھے۔ یہ شاہی باغ تھا جس کے آم سوائے شاہی خاندان کے کسی کو میسر نہ آتے تھے۔ مرزا بعض درختوں کے آموں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟" مرزا نے باادب عرض کیا۔ "حضور! کسی نے کہا ہے کہ ہر دانہ پر اس کے کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسی آم پر میرا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔"

بادشاہ یہ جواب سن کر بہت ہنسے اور دوسرے روز اس چٹکلے کے عوض ایک بہنگی عمدہ آموں کی مرزا کے گھر بھجوا دی۔

مرزا کے ایک دوست کو آم اچھے نہیں لگتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک گدھے والا سامنے سے گزرا۔ گدھے نے پڑے ہوئے آموں کے چھلکوں کو سونگھ کر چھوڑ دیا۔ دوست نے کہا۔ مرزا صاحب! دیکھئے۔ آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے جواب دیا۔ بے شک گدھا آم نہیں کھاتا۔"

حضرت تپش مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ مراسلت سے شاگرد ہوئے تھے۔ دہلی مرزا صاحب سے ملنے آئے تھے۔ گھبراہٹ میں دیوان کا صاف شدہ مسودہ بھول گئے ایک دوسرا مجموعہ تھا وہ ہمراہ چلا آیا۔ مرزا صاحب سے اپنے دیوان کا ذکر کیا اور اس مجموعہ کو ملاحظہ سے گزارا۔ اس میں بہت تھوڑا کلام اُن کا تھا۔ باقی دوسروں کا کلام تھا۔ پوری پوری غزلیں بھی نہ تھیں۔ مرزا صاحب نے دیکھ کر کہا ؎ ڈیڑھ جُز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غالب

غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا!

تپش صاحب نے اس مجموعہ کو واپس لیکر دیکھا تو دیوان نہ تھا۔ دوسرا نسخہ تھا۔ جلد ایک سی بنی تھی۔ اس سے دھوکہ ہوا۔ مرزا صاحب سے بے حد معذرت کی۔ اور دوبارہ وہ دیوان لے جا کر دکھایا اور اصلاح لی۔ یہ دیوان ان کے پوتے منشی عبدالمجید تاج محلی کے یہاں بطور تبرک موجود ہے۔

ایک دن کہیں مشاعرہ تھا۔ اژدحام تھا۔ مرزا غالب بھی شریک تھے۔ لیکن جگہ بیٹھنے کی نہ تھی۔ بہاری لال مشتاق بھی مشاعرہ میں آئے تو انہوں نے یہ رنگ دیکھ کر صاحب مشاعرہ سے اپنے لئے انتظام مشاعرہ کی خدمت لے لی۔ چنانچہ خاصدان لیکر شعراء کے سامنے تواضع کے لئے پہنچ گئے۔ مرزا صاحب نے کہا۔ مشتاق! لطیفہ کہا ہے۔ برجستہ فرمایا ؎

غیروں نے بیٹھنے نہ دیا جب کہیں مجھے
میں انجمن میں منتظم انجمن ہوا!

مرزا الٰہی بخش معروف مرزا کے خسر تھے۔ وہ درویش اور لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے اور بیعت کے بعد ایک شجرہ ہر مرید کو بھی ہر ایک کو دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی مرید کو دینے کے لئے انہوں نے مرزا غالب کو ایک شجرہ دیا کہ اس کی نقل کر دیں۔ مرزا نے شجرہ اس طرح نقل کیا کہ ایک نام لکھا اور دوسرا حذف کر دیا۔ پھر تیسرا لکھ دیا اور چوتھا چھوڑ دیا۔ اس طرح جان بوجھ کر شجرہ غلط اور نامکمل نقل کر کے مرزا نے انہیں دے دیا۔ مرزا الٰہی بخش نے جب شجرہ دیکھا تو مرزا سے دریافت کیا کہ یہ شجرہ تم نے کیا نقل کیا؟ مرزا نے جواب دیا۔ "قبلہ اس کا کچھ خیال نہ فرمایئے۔ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے۔ زینے کی ایک سیڑھی اگر بیچ سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی اچک اچک کر اوپر پہنچ سکتا ہے۔" یہ سن کر مرزا الٰہی بخش بہت برہم ہوئے اور مرزا سے پھر کبھی شجرہ نقل نہ کرایا اور مرزا کو غیر پسندیدہ کام سے نجات مل گئی۔

غالبؔ یاس اور اُمید کے دوراہے پر

پنڈت کیلاش ناتھ کول
میکش کاشمیری

مرزا کو رجائی یا قنوطی کسی ایک طبقے سے منسلک کرنا سراسر بے انصافی ہے۔ کیونکہ زندگی سے متعلق اُن کا کوئی معیّن فلسفہ نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وُہ وحدت الوجود کا نظریہ رکھتے تھے۔ وُہ نہ تو محض رجائی تھے اور نہ محض قنوطی۔ البتہ اُمید و یاس کے دوراہے پر مزدد کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ان دو متضاد میلانات کا پایا جانا قدرتی بات تھی۔ آخر یہ کشمکش ہے اُمید و یاس کی۔ یہ زندگی کیا ہے" اور پھر اپنی اس دو گونہ گُل افشانی کے بارے میں وُہ خود بھی تو فرماتے ہیں ؎

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے • فریاد کی کوئی نَے نہیں ہے

نغمۂ غم ہو یا نغمۂ شادی' مرزا کے کان ہر دو آہنگ سے آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر رنگ اور ہر مزاج کا آدمی اُن کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ غالبؔ کا سارا دیوان کھنگال ڈالیے کہیں آپ کو پسپائی و نا اُمیدی ملے گی تو کہیں بلند حوصلگی و اُمید کی تابناکی۔ انہی دو رنگوں سے اس چمن کی فضا تیار ہوئی ہے۔ غرض "دیوانِ غالبؔ" یاس انگیز و نشاط آفرین اشعار کا ایک مرقع ہے۔ مرزا کی نظم و نثر میں زندگی کے دونوں پہلو نمایاں ملیں گے۔ حُزن و ملال کا اظہار بھی اور نشاط و سکونِ حیات کا پیغام بھی۔

آیئے سب سے پہلے ہم یاس کے آئینے میں مرزا کے اُن اشعار کا جائزہ لیں جن میں مرزا کی نامرادیاں اور حسرت ناکیاں منعکس ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وُہ بھی نہ ہوا

مجھے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا!

خزاں کیا فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

مرزا غالبؔ اور زندگی سے اس قدر بیزار! دُنیا سے یہ فرار! کہ الامان و الحفیظ! ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اور تو اور بے چارے غالبؔ کو عید کے دن بھی دل برداشتہ ہی دیکھیے کا ؎

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

کہتے ہیں دُنیا بہ امید قائم" مگر صاحب ذرا مرزا سے تو پوچھئے تو فرمانے لگیں گے ؎

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں!

ظاہر ہے کہ ماحول نے مرزا کو غم دیا اس کا شاعر بنا دیا تھا۔ وُہ اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ماحول سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھیں تلخ لمحات بہت دیکھنے پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں یاس و قنوطیت کا عنصر رجائیت سے کہیں زیادہ ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ہندوستان کی ہیئت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ بلند و بالا تہذیب کی علمبردار مغلیہ سلطنت آخری دموں پر تھی۔ بہادر شاہ ظفر قید کر لئے گئے تھے۔ آوارہ دلّی کی آندھی کیا چلی۔ مرزا کے کیسے کیسے رفیق و شفیق اور ہم نوالہ و ہم پیالہ یا تو غریب الدّیار ہو گئے یا پھر موت سے ہم آغوش ہو گئے۔ اس کا تذکرہ مرزا نے اپنے خطوط میں شدت سے کیا ہے۔ شاہ خرچی بھی انھیں لے ڈوبی، قرض خواہوں سے انھیں کب رہائی ملی۔ زندگی کے بہترین سال انھوں نے جاگیر کی تگ و دو میں گزار دئے۔ اور اس پر بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بھائی مرزا یوسف پاگل ہو گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ پچاس برس کی عمر میں انہیں جیل جانا پڑا۔ لاولد تھے۔ عارف اور یتیم کو گود لیا اور انہیں دل و جان سے پیار کیا مگر مشیتِ ایزدی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ وُہ بھی داغِ مفارقت دے کر چلتے بنے۔ غرض ان گوناگوں پریشانیوں اور صدموں نے اُن کی زندگی اجیرن بنا دی تھی اور وہ راحت و آسودگی کے لئے عمر بھر ترستے رہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مگر ان تمام محرومیوں اور آفتوں کے باوجود مرزا نے امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ بہت بڑے رجائی بھی تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ہے غنیمت کہ بہ امید گذر جائے گی عمر
نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی

وُہ ہر دکھ درد کو ہنسی خوشی کاٹ دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

وُہ ناامیدی کو امید میں بدل دینے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں ؎

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

(بشکریہ ریڈیو کشمیر جموں)

(ٹین ڈیالیس) "د" غالب

بھیجی ہے جو شاہِ جم جاہ نے دال
(کھانے والے چنے کی دال)

ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
(دلالت کرنے والی)

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال
(د۔ حرف)

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں کہ خدا رکھتے تھے
(غالبؔ)

آہ غالبؔ!

نوٹ:۔ غالبؔ کا یہ مرثیہ ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ یہ مرثیہ اُس محبت و عقیدت کا آئینہ ہے جو حالیؔ کو غالبؔ سے تھی اور ساتھ ہی کمالِ شاعری کا نمونہ بھی، شاگرد کے دل کی کیفیت اور عقیدت شعروں میں ڈھل کر نکل آئی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین کی رائے میں "حالیؔ نے غالبؔ کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی۔" مرثیے کی اس قسم میں حالیؔ کا کوئی مدِ مقابل آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ایک چھوٹی سی بحر میں فصاحت و بلاغت کا وہ دریا موجزن ہے، جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ (مدیر)

فغانِ حالیؔ

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات! ! !　　جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس　　پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج　　رِند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضمون اُس کا ایک ٹھٹول　　سَو تکلف اور اُس کی سیدھی بات

ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا!　　قلم اُس کا تھا اور اُس کی دوات

اُس کے مرنے سے مر گئی دلّی　　خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اُس کی بزم　　یاں اگر ذات تھی تو اُس کی ذات

دل کو باتیں جب اُس کی یاد آئیں　　کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل　　کس سے دادِ سخن دری پائیں

مرثیہ اُس کا لکھتے ہیں احباب کس سے اصلاح لیں، کدھر جائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہلِ میّت جنازہ ٹھیرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اُس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح اہلِ انصاف غور فرمائیں!
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے ہے ادب شرط مُنہ نہ کھلوائیں

غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر، حسن وجمال کی صورت نظم، غنج و دلال کی صورت
تہنیت، اک نشاط کی تصویر تعزیت، اک ملال کی صورت
اُس کی تادیل سے بدلتی تھی رنگِ ہجران، وصال کی صورت
چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے غالبؔ بے مثال کی صورت

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج اپنا، بے گانہ اشک بار ہے آج
تھا زمانے میں ایک رنگین طبع رُخصت موسمِ بہار ہے آج
تھی ہر ایک بات نیشتر جس کی اُس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد کس سے خالی ہوا جہاں آباد

شاعری کا کیا حق اُس نے ادا پر کوئی اُس کا حق گذار نہ تھا
بے صلہ مدح، شعر بے تحسین سخن اُس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذرِ سائل تھی جان تک، لیکن درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی نہ تھا گلہ دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زُہد کے بدلے زُہد اُس کا اگر شعار نہ تھا

منظہر شانِ حُسنِ فطرت تھا
معنیٔ لفظِ آدمیت تھا!

ہند میں نام پائے گا اب کون سکّہ اپنا جمائے گا اب کون
اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے اُس کو دِل سے بھلائے گا اب کون
اُس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے جا کے دِلّی سے آئے گا اب کون
مرگیا قدر دانِ فہمِ سخن! شعر ہم کو سُنائے گا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

نہ رنجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالب
بہ دار الملک معنی می کنم فرماں روائی ہا

(غالب)

غالب جدید شعرائے کی ایک مجلس میں

جناب کنہیا لال کپور

دورِ جدید کے شعراء کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعراء تشریف فرما ہیں، مثلاً م۔ ن۔ ارشد، میراجی، ڈاکٹر قربان حسین خالص، میاں رفیق احمد خوگر، راجہ عہد علی خان، پروفیسر غیظ احمد غیظ، بکرماجیت ورما، عبدالحئی نگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں "دیوانِ غالب" کا ایک نسخہ ہے تمام شعراء کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔

غالب۔ حضرات میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا ہے۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعراء سے شرفِ نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب۔ رہنے بھی دیجئے اس بے جا تعریف کو، من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر۔ تشریف رکھئے گا کہئے جنت میں تو خوب گذرتی ہے، آپ تو فرمایا کرتے تھے۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔

غالب۔ (مسکرا کر) بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے جب سے وہاں گیا ہوں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر۔ تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے پینے کو شراب، انتقام کے لئے پری زاد، اور اس پر یہ فکر کو سوں دور کہ ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ۔۔۔۔۔

تیسرا شاعر۔ (بات کاٹ کر) سنائیے اقبال کا کیا حال ہے؟

غالب۔ وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا وہی پرانی عادت۔

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر۔ میرا خیال ہے وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کاروائی شروع کر لی جائے۔

دوسرا شاعر۔ میں کرسیِ صدارت کے لئے جناب م۔ ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسیِ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرینِ مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں)۔

م۔ ن۔ ارشد۔ میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیئے۔ میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب۔ بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م۔ ن۔ ارشد۔ معاف کیجئے گا، مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔ شمع کے بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے اس کی روشنی میں ہر شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب۔ بہت اچھا صاحب تو غزل سنئے۔

باقی شعراء۔ ارشاد۔

غالب۔ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعراء ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)۔

غالب۔ اجی صاحب یہ کیا حرکت نہ داد نہ تحسین اس بے موقع خندہ زنی کا کیا مطلب۔

ایک شاعر۔ معاف کیجئے، مرزا ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے؟

غالب۔ بے معنی؟

میرا جی۔ دیکھئے نہ مرزا آپ فرماتے ہیں خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا اور اگر آپ معشوق کے نام ہی کے عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا۔ فرد سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ دیجئے۔

ڈاکٹر قربان حسین۔ میرے خیال میں اگر یہ خط اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اک اک نظم
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ تم الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب۔ یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ، میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

میرا جی۔ جنون! جنون کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے۔ اجازت ہو تو کہوں۔

غالب۔ ہاں، ہاں بڑے شوق سے۔

جنوں ہوا جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی وجہ ہے کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب۔ (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ ن۔ ارشد۔ اب مرزا غزل کا دوسرا شعر فرمائیے۔

غالب۔ میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحیٰ نگاہ۔ گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح لکھا جائے تو ایک بات پیدا ہو جاتی ہے۔

غالب۔ کس طرح۔

عبدالحیٰ نگاہ۔ عشق نے ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے سمجھے تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمہارے عشق نے

گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا

غالب۔ (طنزاً) بہت خوب بھئی غضب کر دیا۔
غیظ احمد غیظ۔ اور دوسرا مصرعہ اس طرح لکھا
جا سکتا تھا۔
جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک نہ مجھ کو ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب۔ واللہ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ
اپنا اپنا کلام سنائیں۔
م۔ن۔ ارشد۔ اب ڈاکٹر قربان خالص جو جدید شاعری
کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔
ڈاکٹر خالص۔ اجی ارشد صاحب میں کیا ہوں اگر میں
امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید
شاعری کی منزل ہیں۔ اور میں سنگ میل
اس لئے آپ اپنا کلام پہلے پڑھیے۔
م۔ن۔ ارشد۔ توبہ توبہ اتنی کسر نفسی اچھا اگر آپ مصر
ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔
نظم کا عنوان "بدلہ" عرض کیا ہے۔
آمری جان میرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کی آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی تنہائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں

ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو ایک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند
دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں بیکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی کیا جینا ہے
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
آمری جان میرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارض گلفام تیرا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گذر جانے پر
بہر جمع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی
ہے۔ میراجی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس
صدی کی بہترین نظم ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا۔ اگر ایک طرح
سے دیکھا جائے تو اس انگیٹھی، بھوت اور دفتر تہذیب و تمدن
کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں) حاضرین ایک دوسرے کو
معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں۔
غالب۔ ارشد صاحب معاف کیجئے گا۔ آپ کی یہ نظم
کم از کم میری فہم سے تو بالاتر ہے۔
غیظ احمد غیظ۔ یہ صرف ارشد پر کیا منحصر ہے مشرق
کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم اور ادراک سے
بالاتر ہے۔
م۔ن۔ ارشد۔ مثلاً میرے ایک دوست کے اس
شعر کو لیجئے ہے
پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گذر جائے گی سر سے

اب بتائیے اس شعر کا مطلب کیا ہے؟

غالب :۔ (شعر کو دہرا کر) سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ ن۔ ارشد۔ اجی چھوڑئیے اس حرف گیری کو آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے، کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں

ڈاکٹر خالص :۔ میری نظم کا عنوان ہے "عشق" عرض کیا ہے

عشق کیا ہے؟
میں نے ایک عاشق سے پوچھا۔
اس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالہ عشق
عشق ہے پیغام موت

غالب ۔ بھئی کیا مذاق ہے نظم پڑھئے مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص (جھنجھلا کر) تو کیا آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے، نہ ترنم، نہ قافیہ، نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص ۔ مرزا صاحب یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کئے ہیں۔ جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں میری مراد رفعت تخیل تازگی افکار اور ندرت فکر سے ہے

غالب ۔ رفعت تخیل کیا خوب پرواز ہے

میں نے اک عاشق سے پوچھا اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص ۔ (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب ۔ مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر ۔ اس کی وجہ مغربی تقلید نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے اس کے علاوہ دور جدید کی روح انقلاب کشمکش تحقیق تجسس تعقل پرستی اور جد و جہد ہے ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو ٹھکرے نے بھی اپنی کتاب ونیلٹی فیر میں تسلیم کیا ہے چنانچہ اسی لئے ہم نے محسوس کیا ہے کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعراء اور جدید شعراء کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعراء بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب ۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن۔ ارشد، خوگر۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو، ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ یہ بھوک، بیکاری، انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت

حسن و عشق گل و بلبل شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لئے اور بھی موضوع سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی ہے
ہم پہ کیا گذرے گی اجداد پہ کیا گذری ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے

راجہ مہدی علی خاں۔ بہت خوب ہے "یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے" ایسے ہی مضامین میں ایک مضمون "ڈاک خانہ" ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب۔ ڈاک خانہ۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی
ان میں ہر ایک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اُسے
ڈاک خانے میں آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
دیکھنا آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
بمبئی کو مصر کو لندن کو کوہِ قاف کو
کون کہتا ہے کہ ایک عورت ہے یہ
یہ لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال۔ خدد خالی
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل

اُف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور۔ کہ ہمارے نوجوان
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکہ ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے ہر طرف مرحبا بھئی کمال کر دیا کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔)

م۔ ن۔ ارشد۔ اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ:۔ آپ کی مرضی تو وہی سنیئے۔ عنوان ہے "لگائی"

فون پر آیا دل زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہو گا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)۔

م۔ ن۔ ارشد۔ حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشسٹ

جذبے کو خوب نبھایا ہے)۔

رفیق احمد۔ (سرگوشی کے انداز میں ہیراجی سے) بکواس ہے۔

م۔ ن۔ ارشد۔ اب ہیراجی اپنا کلام سنائیں گے۔

ہیراجی۔ میری نظم کا عنوان ہے بینگن۔

غالب۔ بینگن!

ہیراجی۔ بینگن اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں
تو کیا میں بینگن پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں۔

غالب۔ معاف کیجئے گا نظم پڑھیے۔

ہیراجی۔ عرض کیا ہے ؎

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں ہے تو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھارانی آ ہی گئی تو
کرشن کنھیا ڈھونڈ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی ہے
بھوک لگی تھی کہتی ہائے
جی میں بھی ایک بھون کے بینگن
کھاؤں گی لیکن رادھا پیاری
رنگ کے اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لئے بھوکا رہنا بہتر
چونکہ ہوں میں پریم پجاری

(ہر طرف داد دی جاتی ہے۔ بعض شعراء کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں۔ بھئی جدید شاعری ہیراجی ہی کا حصہ ہے۔)

م۔ ن۔ ارشد۔ اب جناب دکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔

دکرماجیت ورما۔ میں نے حسبِ معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب۔ (حیران ہوکر) شاعر اب گیت لکھ رہا ہے۔ میرے اللہ دنیا اب کدھر جا رہی ہے۔

بکرماجیت ورما۔ مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیئے گئے تھے۔ دورِ جدید کے شعرائے انہیں ایک قابلِ عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب۔ جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں بھانڈ مراسی یا اسی قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

دکرماجیت ورما۔ پہلا گیت "برہن کا سندیش" عرض کیا ہے۔

اُڑ جا دیس بدیس رے کوے اُڑ جا دیس بدیس۔
سُن کر تیری کائیں

غالب۔ سُن کر تیری کائیں کائیں

دکرماجیت ورما۔ عرض کیا ہے ؎

سُن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں۔
مت جا نا پردیس رے کوے تم اُڑ جا دیس بدیس

م۔ ن۔ ارشد۔ بھئی کیا اچھوتا خیال ہے۔ پنڈت صاحب میرے خیال میں ایک گیت آپ نے "کبوتر" بھی لکھا تھا وہ بھی مرزا کو سنا دیجئے۔

دکرماجیت ورما۔ سنئے۔ پہلا بند ہے "بول کبوتر بول"۔

دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اُٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے۔
بول غٹر غوں بول کبوتر

باقی شعراء (ایک زبان ہوکر) بول کبوتر بول کبوتر بول کبوتر بول۔

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)۔

بکرماجیت ورما۔ اب دوسرا بند سنئے۔

بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے۔

(صہ ۶۲ پر)

نذرِ غالب

جنابِ گھمبیر داس ساحرؔ سیالکوٹی

شمعِ روشن تو رہی رات بسر ہونے تک
گل کوئی اور نہ کھل جائے سحر ہونے تک

میری آنکھوں سے گرا تھا ترے دامن پہ ابھی
دیر کیا لگتی ہے قطرے کو گہر ہونے تک

ختم کرنا ہی پڑے گا مجھے افسانۂ غم
بات آ پہنچی تری آنکھ کے تر ہونے تک

شمع نے ڈھیر لگا رکھے ہیں پروانوں کے
دیکھیں کیا حال ہو اس کا بھی سحر ہونے تک

ہے محبت کی تو کچھ بات ہی اور اے ناصح
کوئی سودا بھی ہو جاتا نہیں سر ہونے تک

تھا مجھے وعدۂ فردا کا سہارا ورنہ
کون جیتا ہے شبِ ہجر بسر ہونے تک

دل کی جانب جب اٹھی سامنے پایا تم کو
خام تھی اپنی نظر مائلِ در ہونے تک

حشر کا ڈر ہی نہ ہو جب تو نمازیں کیسی
یہ تکلف بھی تو ہے حشر کا ڈر ہونے تک

شعر کہنا بھی تو کچھ سہل نہیں اے ساحرؔ
بات بنتی ہی نہیں خونِ جگر ہونے تک

مرنے سے پہلے شعر

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

غالبؔ

طاؤس شرح

ڈاکٹر گیان چند صاحب، صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی جموں

زبس خوں گشتۂ رشکِ وفا تھا وہمِ بسمل کا
چرایا زخم ہائے دل نے پانی تیغِ قاتل کا

پانی چرانے کے معنی لغت میں زخم کا پانی جذب کرنا بھی دئے ہیں لیکن یہاں اس کا موقع نہیں۔ تلوار کی دھار کو آب کہتے ہیں اور آب کے معنی پانی بھی ہیں۔ اس طرح تلوار میں پانی کا فرضی وجود ہو گیا۔ بسمل کو وفا کے معاملے میں بڑا رشک تھا۔ اسے یہ تاب نہ تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی تیغِ بسمل سے وفا کرے۔ وہمِ بسمل اس رشک میں خون ہو گیا تھا۔ یعنی بہت زیادہ متردد تھا۔ اس نے دیکھا کہ تیغ بسمل کو چھونا تو میرا حق ہے لیکن آب تیغ بھی تیغ کو چھو رہا ہے۔ رشک کی وجہ سے اس نے اس پانی کو چرا لیا تاکہ تیغ قاتل بلا شرکتِ غیرے صرف اسی کے لئے وقف ہو کر رہ جائے۔ اصل معنی یہ ہیں کہ بسمل کو بڑے مبالغے کے ساتھ وفا تھی اس لئے اس نے تیغِ قاتل کی دھار اپنے دل کے زخموں میں لے لی۔

نگاہِ چشمِ حاسد وام لے، اے ذوقِ خود بینی
تماشائی ہوں، وحدت خانۂ آئینۂ دل کا

مجھے اس معنی میں خود بینی کا شوق ہے کہ میں آئینۂ دل کا تماشائی ہوں اور یہ آئینہ وحدت خانہ ہے۔ اسمیں محض ایک ہی تصویر ہے۔ چھوٹے سے دل کے اندر رہنے والی باریک سی وحدت کو دیکھنے کے لئے بڑی باریک نظر کی ضرورت ہے۔ حاسد کی نظر بہت تنگ یا تنگ بین ہوتی ہے۔ اس سے شاعر نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ باریک بینی کے لئے نگاہِ حاسد بہت کارگر رہے گی۔ اس لئے ذوقِ خود بینی سے کہا ہے کہ نگاہِ حاسد اُدھار لے۔

شرر فرصت نگہ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے
بقدرِ رنگ، یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

نگاہِ محبوب شرر فرصت ہے یعنی محبوب کی نگہ کو شرر برسانے کی فرصت ہے جس کی وجہ سے ایک عالم میں آگ لگ کر چراغاں کا سامان ہو جائے گا۔ اس آگ سے جتنا رنگ مہیا ہو گا۔ اسی کی مناسبت سے دنیا کا پیمانہ گردش میں ہو گا۔ جو رنگ چراغاں سے فراہم ہو گا تو ظاہر ہے کہ پیمانے میں شراب کس قسم کی ہو گی۔ ظاہر ہے کہ درد کی ہو گی اور یہ رنگ پیمانے کی گردش نشاط کی نشانی نہیں بلکہ اضطراب کی نشانی ہو گی۔

سراسر تاختن کو ششش جہت یک عرصہ جولاں تھا
ہوا واماندگی سے رہرواں کی، فرق منزل کا

ششش جہت۔ چھ سمتیں یعنی مشرق، مغرب، شمال، جنوب، اوپر، نیچے مجازاً ششش جہت سے پوری کائنات مراد ہے۔ دوڑنے کے لئے کائنات ایک میدان ایک منزل تھی۔ لیکن رہرو تھک کر جگہ جگہ رک جاتے تھے اس سے منزلوں کا فرق ہوا اور جہتوں کی تقسیم کی گئی ورنہ ہماری ہمت تو یہ تھی کہ سب کو ایک دوڑ میں قطع کر لیں۔

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

شروع شروع میں غالب بیدل کے مداح اور مقلد تھے۔ ابتدائی شاعری بیدل کے رنگ ہی میں ہے کہتے ہیں کہ میرے لئے دشتِ سخن میں بیدل کا قلم یعنی شاعری

خضر کی طرح رہنما ہے اس لئے مجھے گمراہی کا خوف نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں غالب راہِ سخن میں گمراہ تھے۔ اور اس گمرہی کا باعث خامۂ بیدل ہی تھا۔

شگفتن کمیں گاہِ تقریب جوئی

تصور ہوں بے موجب آزردگاں کا

اس شعر کی توسیع شدہ نثر یہ ہوگی: میں ان بے موجب آزردگاں کا تصور ہوں جن کی تقریب جوئی کی کمیں گاہ میں شگفتن رہتی ہے۔ چاہیئے تھا کہ شگفتن در کمیں گاہ کہتے لیکن اختصار مصرعے کی مجبوری سے ایسا نہ کر سکے اور شگفتن کو ہی کمیں گاہ قرار دے دیا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں ان لوگوں کا تصور ہوں جو بغیر کسی خاص وجہ کے ملول ہو جاتے ہیں۔ یقینی ہے کہ کچھ نہ کچھ دیر بعد وہ خوش ہو جائیں گے یعنی خوشی ان کا قرب ڈھونڈنے کی تاک میں ہے۔ میں گو اس وقت رنجیدہ ہوں لیکن امید ہے کہ جلد ہی میں شگفتہ خاطر ہو جاؤں گا۔

غریب ستم دیدۂ بازگشتن

سخن ہوں، سخن بر لب آوردگاں کا

بازگشتن:۔ کہیں جا کر واپس پلٹ آنا۔ سخن برلب آوردگان:۔ وہ لوگ جو بات ہونٹوں تک لائے لیکن پھر پی گئے اسے ادا نہ کیا۔ میں ایسی بات ہوں جو ہونٹوں تک لانے کے بعد واپس کر دی گئی ہو۔ میں نے زندگی میں ایک بار کہیں جانے اور پھر وہاں سے بے نیل مرام پلٹ آنے کا ستم دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن

ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

میں ٹوٹ جانے یعنی بالکل مایوس ہو جانے کا آئینہ دار ہوں جو لوگ بالکل افسردہ ہوتے ہیں وہ کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو کچھ دیر بعد اس ارادے کو توڑ دیتے ہیں۔ میں بھی اسی طرح نفسیاتی شکست و ریخت کی تصویر ہوں۔ ایک اور جگہ کہا ہے۔

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

بصورتِ تکلف، بمعنی تاسف

اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

میں پژمردہ اور افسردہ لوگوں کے تبسم کی طرح ہوں جو ظاہراً محض تکلف اور آورد ہوتا ہے۔ اور باطن میں تاسف و رنج میں بھی ظاہرا اوپری دل سے خوش و خرم ہوں لیکن در اصل بجھا ہوا ہوں۔

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا

اِک گھر میں مختصر سا بیابان ضرور تھا

جنون میں ایک طرف تڑپ کا تقاضا تھا کہ جنگل میں بھاگ دوڑ مچائی جائے۔ دوسری طرف کمزوری کا یہ عالم تھا کہ دروازے تک جانا بھی مشکل تھا۔ یہ ضروری تھا کہ گھر میں ایک مختصر سا بیاباں ہوتا تاکہ اسی میں جنون کی جولانی کر لیتے۔ شاعر کو اس سے واسطہ نہیں کہ ضعف کی وجہ سے جب دروازے تک چل کر بھی نہیں جا سکتے تھے تو بیابانِ صحن خانہ میں کیونکر جولانی دکھاتے۔ شاید یہ ہو کہ صحرا جولانی کے لئے نہیں چاہیئے بلکہ محض ویرانی اور سنسانی کے لئے تاکہ وحشت کو مانوس ماحول مل سکے۔

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق! ورنہ یاں

ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا

نگاہِ عشق کی غفلت ہے ورنہ پتھر کا ہر ٹکڑا کوہِ طور کے لختِ جگر کی طرح برقِ تجلی سے منور ہے۔ اس شعر میں ہمہ اوست کا مضمون ہے۔

دربیں تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے

وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

میرا دل پہلے اتنا خاموش تھا کہ اس کا تخلص صبور یعنی صابر تھا۔ اب عشق کی بدولت اس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ بجلی اس سے تڑپنے کا سبق لیتی ہے۔

شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانۂ رات، ماہ کا لبریز نور تھا

پیمانہ لبریز ہونا:- زندگی کا اختتام ہو جانا۔ چاند کے پیمانہ کو لبریز کرنے کے لئے مظروف جو تلاش کیا وہ نور ہے۔ رات چاند کا پیمانہ لبریز تھا۔ غالباً ترے گال دیکھ کر اس کی یہ حالت ہوتی گئی اور وہ مر گیا ہوگا

جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر
جوہر سواد، جلوۂ مژگانِ حور تھا

تیری تلوار کے مقتولین جنت میں جائیں گے۔ جنت ان کی منتظر ہے۔ چونکہ انہیں جوہرِ تیغ پسند ہے۔ اس لئے جنت میں بھی اس سے مشابہ چیز کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ حوروں کی پلکوں کا جلوہ جوہرِ تیغ کی طرح ہے۔ جوہر سواد:- جس کے آس پاس جوہر ہو۔

ہر رنگ میں جلا اسدؔ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیٔ شمعِ ظہور تھا۔

اسدؔ جیسے تمام عمر فتنے کا انتظار رہا جلتا ہی رہا۔ وہ شمع کی روشنی کا پروانہ تھا۔ اگر اس سے مراد تجلی خدائی جائے تو ابھی اس شمع کا ظہور نہیں ہوا۔ جب یہ تجلی ظاہر ہوگی تو بڑا فتنہ ہوگا۔ یعنی عالم میں حشر ہو جائے گا۔

بہار رنگِ خونِ گل ہے ساماں اشک باری کا
جنونِ برق نشتر ہے رگِ ابرِ بہاری کا

ہندوستان کی بہار مارچ میں نہیں برسات میں ہوتی ہے۔ یہ شعر ایسے ہی موسم کے لئے کہا گیا ہے جہاں ایک طرف پھول کھلے ہوں اور دوسری طرف بادل برس رہے ہوں اور بجلی چمک رہی ہو۔ بہار میں رنگ کا ہے سے آتا ہے پھولوں کے خون سے۔ یہ پھولوں کی سرخی نہیں ان کا خون ہے۔ چونکہ پھولوں کا قتل ہوا ہے اس لئے فصلِ بہار میں اشک باری کرنا چاہیئے۔ یہ بجلی جو چمکتی ہے یہ دراصل بادل کی رگ میں نشتر چبھو رہی ہے تاکہ اس کی فصد کھول کر اس میں سے خون بہے۔ بادل میں سے پانی گرنے لگتا ہے

اور یہ گویا خونِ گل پر آنسو بہانا ہے۔ شعر میں حسنِ تعلیل ہے۔

برائے حلِ مشکل ہوں زپا افتادۂ حسرت
بندھا ہے عقدۂ خاطر سے پیماں خاکساری کا

زپا افتادہ حسرت:- حسرت نے جس کے پاؤں کھینچ کر زمین پر گرا دیا ہے۔ میں اپنی مشکل حل کرنے کے لئے یا اپنی حسرت پوری کرنے کے لئے بالکل خاکسار ہو گیا ہوں۔ میرے عقدۂ خاطر کے ساتھ خاکساری کا عہد ہے یعنی عقدۂ خاطر اسی وقت کھلے گا جب میں انتہائی عاجزی و خاکساری کا ثبوت دوں گا۔ چونکہ اب یہ زمین پر گر گئے ہیں، سر بہ خاک ہو گئے ہیں اس لئے امید ہے کہ ان کے دل کی گرہ کھل جائیگی

بوقت سرنگونی ہے تصور انتظارستاں
نگہ کو آبلوں سے شغل ہے اختر شماری کا

گرمیوں کی رات میں کھلے صحن میں بیٹھے یا لیٹے کسی کا انتظار کیجئے اور وہ گھنٹوں تک نہ آئے۔ آپ بار بار آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کا مشاہدہ کرنے لگیں۔ اسی کیفیت کی وجہ سے انتظار میں تارے گننا ایک محاورہ بن گیا۔ شاعر محبوب کے تصور میں سر نیچا کئے بیٹھا ہے۔ اس کی نظر جسم کے آبلوں پر پڑتی ہے اور وہ ان کا شمار کرنے لگتا ہے۔ آبلے تاروں کی طرح ہوتے ہیں گویا آبلہ شماری نہیں ہوئی اختر شماری ہو گئی تصورِ محبوب نہ ہوا انتظارِ محبوب ہو گیا۔ انتظارستان:- انتظار کی دنیا۔ تصور انتظار میں بدل کر رہ جاتا ہے۔

اسدؔ ساغر کش تسلیم ہو گردش سے گردوں کی
کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے گلہ بد روزگاری کا

پہلے مصرعہ میں ایک استعارے سے کام لیا ہے۔ ساغر دل کا دور چل رہا ہے۔ اس گردش میں سے ساغر لینا۔ آسمان گھومتا ہے۔ یہ گردش طرح طرح کی تبدیلیاں لاتی ہے۔ شاعر نے اس گردش کو پیالوں کی گردش قرار دیا اور اس میں سے رضا کا ساغر کا پیالہ لینا چاہا۔ استعارہ دور کر کے کہیں تو یوں ہوگا۔ اسدؔ آسمان جو کچھ نیرنگ سازی کر رہا ہے تو اس کے

آگے سرِ تسلیم خم کر اور انہیں قبول کرے کیونکہ اپنے حالِ بد کا شکوہ کرنا رندوں کی عقل کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ دُنیا کے زیر و زبر کی حیثیت ہی کیا ہے جس کے لئے گلہ کیا جائے۔

طاؤس در رکاب ہے ہر ذرّہ آہ کا
یا رب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا

طاؤس ایک بہت خوش رنگ پرندہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالب کا محبوب پرندہ تھا کیونکہ انھوں نے اشعار کا ذکر بار بار کیا ہے۔ سانس کے ساتھ آہ آتی ہے۔ آہ کے ہر ذرّے میں گویا طاؤس ہمراہ ہوتا ہے۔ یعنی آہ کا ہر ذرّہ طاؤس کی طرح خوش رنگ ہے۔ یا رب میری سانس کس جلوہ گاہ کا غبار ہے۔ جلوہ گاہ ہے۔ وہ میدان جہاں کسی کا جلوہ پڑ رہا ہو۔ اس کا غبار بھی رنگین ہو۔ اسی طاؤس نما رنگین غبار سے ان کی آہ اور سانس کی تشکیل ہوئی ہے۔ یعنی آہ کر رہے ہیں۔ اور خیال میں محبوب کی رنگینی بسی ہوئی ہے۔

عزلت گزینِ بزم ہیں واماندگانِ دید
مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جگہ جگہ جا کر یا ایک ہی جگہ بیٹھے رہ کر دُور دُور کے منظروں پر نظر ڈالی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک محفل میں جم کر بیٹھ جائیں اور دل بہلانے کے لئے میگساری کی جائے۔ غالب کہتے ہیں کہ جو لوگ نظر بازی یا تماشائے دنیا سے تھک گئے ہیں۔ وہ بزم کی تنہائی ڈھونڈتے ہیں۔ اس طرح شراب کی بوتل نگاہ کے پاؤں کا آبلہ بن گئی ہے۔ یعنی گوشۂ بزم میں بیٹھنے کے بعد دُور دُور کا مشاہدہ ممکن نہیں۔ ظاہراً شاعر نے محفل میں (خواہ وہ شراب کی کیوں نہ ہو) بیٹھنے پر سیر و مشاہدہ کو ترجیح دی ہے۔

ہر گام آبلے سے ہے دل در تہِ قدم
کیا بیم اہلِ درد کو سختیِ راہ کا

پہلے غالب نے ایک شعر میں کہا ہے:۔

لوں کب ہر خار سے تھا بسکہ سرِ دزدیِ زخم
جوں نمد ہم نے کفِ پا پہ اسدؔ دل باندھا

تقریباً وہی بات یہاں ہے۔ خراب راستے میں پاؤں کی حفاظت کا ایک نرالا طریقہ یہ ہے کہ کفِ پا پر دل باندھ لیا جائے۔ گو کفِ پا اپنا ہے اور دل کوئی غیر ہے جس کی تکلیف سے رہرو کو کوئی واسطہ نہیں۔ اہلِ درد عشق کا درد رکھنے والے ہیں۔ ان کے پاؤں میں آبلے ہیں۔ اس لئے ہر قدم رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں کے نیچے دل کی گدّی بندھی ہوئی ہے پس انہیں راستہ کی سختی کا کیا ڈر ہے۔

جیبِ نیازِ عشق نشاں دارِ ناز ہے
آئینہ ہوں شکستنِ طرفِ کلاہ کا

فی الحال میرا عشق بہت نیاز کا ثبوت دے رہا ہے لیکن دامنِ نیاز میں ناز و شوکت کا نشان بھی ہے۔ ماضی میں میری کلاہِ فخر کج تھی۔ اب اس کلاہ کا گوشہ پھٹ گیا۔ میں اس بانک کا آئینہ دار ہوں۔ یعنی یہ ظاہر ہے کہ کسی وقت ہم بھی کچھ تھے، گو اس وقت کچھ نہیں گویا میں نیازِ موجودہ و نازِ رفتہ کا مجموعہ ہوں۔

خود پرستی سے رہے باہمدگر نا آشنا
بے کسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا

ہم دونوں اپنی اپنی ذات میں کھوئے رہے میرے پاس صرف بیکسی اور بے چارگی تھی اور تو آئینے میں اپنے رُخ کا مشاہدہ کرتا رہا۔ بے کسی کے لفظی معنی ہیں کسی دوسرے انسان کا نہ ہونا جب میں بے یار و مددگار تنہا تھا تو ظاہر ہے میری تمام تر توجہ اپنی ہی ذات پر رہتی ہوگی۔ تیری خود پرستی آئینہ بینی سے ثابت ہے۔ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے دُور اور نا واقف رہے۔

آتشِ موئے دماغِ شوق ہے تیرا تپاک
ورنہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا آشنا

اے داغِ تمنا تیرے سوا ہم کسی سے واقف نہیں۔ تو نے
(باقی ہے)

مِصرعے یا محاورے

مرزا کی غزلوں کے بعض مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہیں اور اہلِ زبان اکثر جگہ جگہ انہیں بولتے ہیں۔ ان پر تو ضرب المثل کی مثال صادق آتی ہے۔ یہ مصرعے یہاں قارئین کرام کے تفننِ طبع کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مدیر

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے

کوئی امید بر نہیں آتی

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
موت کا ایک دن معین ہے

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

شانِ غالب

(از خواجہ دل محمد، ایم اے)

اللہ اللہ تغزّلِ شانِ غالب
اردو سے متعلق ہے بیانِ غالب
بازو نے محبت زور لگایا لیکن
مغلوب نہ ہو سکی زبانِ غالب

پیامِ غالب

(از خان بہادر رضا علی صاحب وحشت کلکتوی)

نسیمِ صبح گاہی ہے کلامِ جانفزا تیرا
دلوں کو جوش میں لاتا ہے رنگِ آتشیں تیرا
بہارستانِ مضموں ہے خیالِ نکتہ زا تیرا
فروغِ طبع کی معراج ہے فکرِ رسا تیرا
ترا دیوان او غالب دفترِ نازک خیالی ہے
ترا پایہ سخن دانانِ ہندوستان میں عالی ہے

وفاتِ غالب

۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء اور عمر تہتر ۷۳ برس سے کچھ زیادہ سن میں مرزا نے وفات پائی اور دہلی میں بمقامِ درگاہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہ دفن ہوئے۔ قبر پر میر مہدی مجروح کی لکھی ہوئی تاریخ کندہ ہے۔
(مدیر)

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزون
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جب مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

از جناب ڈاکٹر منظر اعظمی
(شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی)

غالبؔ کو ان کے زمانے میں سمجھا نہ جا سکا اس لئے کہ ان کی جدت، روشِ عام سے ہٹی ہوئی ان کی طبیعت۔ ان کے بے چین دل اور حالاتِ زمانہ کو سمجھنے کی ان کی افتادِ طبیعت نے ان کے اشعار کو ان کے زمانے کے لوگوں کے ذہنی معیار سے بلند کر دیا۔ لیکن جب زمانہ بدلا حالات بدلے اور لوگوں کا ذہنی اُفق بھی وسیع ہوا تو وہی اشعار "متاعِ از دست رفتہ" ہو گئے۔ غالبؔ کو لوگوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے اشعار وجد آفریں معلوم ہوئے اور وہی جنس کاسد جس کے لئے کہا گیا تھا۔ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" "نعمت غیر مترقبہ" معلوم ہوئی اور خریداروں کی وہ کثرت ہوئی کہ کلام غالبؔ الماری کی الماریوں میں سے ایک کتاب بن گئی۔ غالبؔ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ "شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن" اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر تہہ در تہہ مستقبل تھا۔ اور ہر مستقبل جو ماضی بن جاتا نئے مستقبل میں نئی صورت سے جلوہ گر ہوتا۔ زمانہ جیسے جیسے ترقی کرتا گیا اس دلی بادہ خوار کے اسرار سربستہ کی گرہوں کو کھولتا گیا۔ اس کے اشعار کے نئے مفاہیم معلوم ہوئے۔ اس باتوں میں نئی کیفیت محسوس ہوئی۔ اس کے کلام سے نئے نئے آہنگ آشکار ہوئے۔

غالبؔ کے کلام کی معنی و بیان کے اعتبار سے بے شمار خوبیاں گنائی گئی ہیں اور بلاشبہ وہ خوبیاں اس میں بدرجہ اتم موجود بھی ہیں۔ حالیؔ نے جس جدت مضامین، طرفگئ خیالات، نئی اور موزوں تشبیہوں کا استعمال، استعارہ و کنایہ کا برمحل استعمال اور شوخی و ظرافت کو کلام غالبؔ میں اجاگر کیا۔ کلام غالبؔ میں اس سے کہیں زیادہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

مضامین کی بلندی، نئے نئے اور جدت انگیز اور متنوع خیالات اور ان کی رنگا رنگی ایسی ایسی تشبیہیں اور ترکیبیں جو اس سے پہلے اردو شاعری میں بہت ہی کم تھیں۔ خوبصورت استعاروں کا استعمال اور شوخی و ظرافت سے پُر انداز نگارش غالبؔ کے کلام کی بلاشبہ اہم خصوصیات ہیں لیکن ان کے انداز گفتار میں کچھ ایسا رنگ بھی ہے۔ کچھ ایسا نیکھا آہنگ بھی ہے۔ کچھ ایسا ہلکا اور شوخ خوبصورت رنگوں کا امتزاج بھی ہے جو اوروں کے یہاں مفقود ہے۔ یہ انداز ایسا ہے کہ صرف غالبؔ کا کہا جا سکتا ہے۔ اس میں غالبؔ بلاشک منفرد ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے اکرام نے ان کے اشعار میں الفاظ فقط اظہار مطلب کا وسیلہ نہیں بلکہ شاعرانہ حسن پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے، کہا ہے۔ اور رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں "اس دلبری اور دلبری" نے غالبؔ کے انداز گفتار کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے ہمیں گنجینۂ معنی کے طلسم سے سروکار نہیں ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس شخص کی شوخئ انداز گفتار کیا کیا گل کتر جاتی ہے۔ کہیں ایمائیت اور اشاریت، کہیں ٹھوس بت گری، کہیں محض خاکہ پیمائی، کہیں شوخ کہیں ہلکے رنگ، کہیں مکمل تصویر اور کہیں تجریدی آرٹ کی سی خوبی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ اس کے انداز گفتار سے اس کے تصورات، اس کی لطافت طبع، اس کی رکھ رکھاؤ کی عادت اور وضعداری، اس کی حسن پرستی اور خودداری، اس کی عشق پسند طبیعت اور آزادہ روی، بے تکلفانہ انداز، شوخی و ظرافت، چھیڑ چھاڑ مگر اس میں بھی ایک خاص رکھ رکھاؤ، ڈرامائیت اور شائستہ مذاق کا جو خوبصورت انداز سامنے آتا ہے وہ بڑا ہی دلنشین اور بڑا ہی وجد آفریں ہے۔

حالی نے اس کے یہاں پہلو دار اشعار تلاش کئے، اکرام نے اشعار کے ترنم اور ہم آہنگی پر سر دھنا، کلیم الدین احمد نے غالب کے یہاں معانی اور الفاظ کو الگ نہیں پایا۔ ان کے خیال میں وہ الفاظ کی صوتی اور جذباتی دونوں حیثیتوں سے واقف تھا۔ اختر اورینوی نے اس کی فنکاری میں جذب، سوز، تخیل کی پرواز اور ادراک کی قوت، وجدان کا حسن اور جانے کیا کیا ڈھونڈ نکالا۔ سرور کے نزدیک ان کے یہاں آرزو و شکست آرزو اور مسرت و حسرت کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ یہ سب سہی لیکن اس کے انداز گفتار میں جو شیرینی، مٹھاس، لطافت اور شائستگی ہے اور اس میں جو لطف ہے وہ کسی چیز میں نہیں۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

کس بے تکلفی اور اپنائیت سے شاعر ایک سنجیدہ بات ایک پُر لطف پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ محبوب کا یہ کہنا کہ دل اگر پڑا ملا تو نہ دیں گے اس انداز میں کہنے کی معصومیت اور اس شوخی کی غمازی کرتا ہے جو محبوبوں کے حسن کو اور جلا بخشتی ہے اور پھر شاعر کا یہ کہنا کہ دل کہاں کہ گم کیجے۔ آپ کا مدعا ہم نے سمجھ لیا۔ بات کی حقیقت بے تکلفی اور اس کے انس کا ترجمان ہے۔ حضرت ناصح کی کم عقلی شور کرنے ہی سے ظاہر ہوئی۔ نمک پاشی حضرت کا وطیرہ اور پھر آپ سے کوئی پوچھے کے طنز اور تم نے کیا مزا پایا کے استفسار نے شعر میں جو لطف پیدا کر دیا وہ غالب کا ہی حصہ ہے۔ کچھ اشعار اور ملاحظہ فرمائیے ؎

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

دیوانگی سہی پر فرزانگی تو ختم نہیں پھر دوست کا فریب کیوں کھاؤں، کیا دیکھتا نہیں کہ دوست ہوتے ہوئے بھی آستین میں چھپا دشنہ اور ہاتھ میں کھلا خنجر ارادے اور نیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ کیا انداز معصومی ہے۔ کچھ حقیقت کچھ دھندلکا، گو نہ سمجھوں اس کی باتیں اور گو اس کی تہہ تک پہنچنا میرے لئے مشکل اگر مجھ جیسے دیوانے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ وہ پری پیکر ذرا بے تکلف ہوا۔ اور تیسرے شعر کا انداز شوخی و ظرافت کا مظہر انداز بھی کس قدر بے ساختہ ہے۔ محبوب کی بدعہدی پر اس سے زیادہ خوبصورت طنز اور کیا ہوگا۔

غالب کے بیشتر اشعار کا انداز معنی و بیان کے لحاظ سے بھی ہو۔ ان کی بے ساختگی، ان کی بے تکلفی، گفتگو کا معصومانہ انداز، کہیں عجز و درماندگی، کہیں سپردگی و بندگی، کہیں عجز و خاکساری اور کہیں ایک ستم زدہ عاشق کی جھنجھلاہٹ، کہیں سرزنش کہیں نصیحت، کہیں برابری کا دعویٰ عجب عجب انداز سے بیان ہوا ہے۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوان میر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

الجھتے ہو جو کبھی دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

کوئی کہو، کوئی بتلاؤ جیسے الفاظ اگر ایک طرف محبوب کی لاعلمی پر طنز ہیں تو دوسری طرف ان کی شہرت اور ان کی دیوانگی جو ہر کہ ومہ کی نظر میں ہے اور ہر شخص جانتا ہے کی طرف بلیغ اشارہ کرتا ہے۔ غالب کا یہ خاص انداز بڑا ہی پر لطف ہے اسی طرح محبوب سے انداز تخاطب میں ایک خوبصورت احتجاج، ایک پُر لطف شکوہ اور ایک حسین سرزنش کا انداز ہے۔ کس خوبی، بے تکلفی اور فنکارانہ طرز سے وہ کہتے ہیں پڑھنے کی چیز ہے۔ تمہیں کہو، تم جانو، تم نے کہا جیسے الفاظ بھی ان کے اس خاص انداز بے تکلفانہ کی غمازی کرتے ہیں جس سے بے ساختگی پھوٹی پڑتی ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

اس انداز گفتگو میں ایک ڈرامائیت اور ایک مکالماتی حسن پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی شکایت، کم کہنے کی التجا اور بے تکلفانہ مکالمے کا ایک طلسماتی لمس ہے جس سے وہی لذت اندوز ہو سکتے ہیں۔ جو ان منزلوں سے گزرے ہیں۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

جہاں شاعر نے کچھ آپ سے اور کچھ دوسروں سے خطاب کیا ہے وہاں اور بھی اس کی معصومانہ بے بسی، اپنے آپ پر ہنسنے کی کیفیت اور اپنے اعمال و حرکات کی ایک عاشقانہ توجیہ کی کیفیت ملتی ہے۔ خصوصاً ان اشعار میں جنہیں

شاعر اپنی ناکامی کو اپنی قسمت کی خرابی، اپنی بدنصیبی اور اپنی ہیچمدانی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس میں اس کی بےبسی، ناکامیابی اور حسرت و اندوہ کی کیفیت اپنے شباب پر ہوتی ہے۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے!

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

اسی طرح ان کے یہاں آتے ہیں۔ ہاں، وا حسرتا، حیف، اے، ہائے، ہائے اور وائے جیسے الفاظ نہ صرف شعر کے معنوی حسن میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ ان کے انداز نگارش کے خطابیہ اور مکالماتی انداز حسن کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ کس طرح ان میں بےتکلفانہ انداز کی جلوہ گری ہے ملاحظہ فرمائیے۔

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

شوخی و ظرافت، طنز و تمسخر اور چھیڑ چھاڑ کا انداز تو اور بھی پر لطف ہے بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے اکثر اشعار کی فضا، دروبست اور انداز کلام میں ایک زیر لب تبسم، ایک خندۂ زیر لبی اور ایک طنزیہ قہقہہ کی صورت ملتی ہے۔ یہ ان کا مزاج تھا جو اشعار کے علاوہ خطوط میں بھی ظاہر ہے۔ تباہی آئی ہو یا وبا، مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا ہو یا سیل بلا کی ہلاکت خیزی ہو، تعزیت ہو یا ماتم پرسی، ایک خاص پر لطف مزاج اور ایک مدلل ظرافت سے وہ غالب کو نہ صرف غم و اندوہ سے نکال لائیں گے بلکہ اس کو مسکرانے پر بھی مجبور کر دیں گے۔ زندگی کے مختلف مسائل، تصور مذہب، جنت و دوزخ اور کائنات کے دوسرے حقائق پر ان کا تمسخرانہ انداز خیال اگر ایک طرف ان کے فلسفۂ زندگی کی غمازی کرتا ہے تو دوسری طرف حیات کی بار گرانی کو ہلکا کر کے پیش کرنے کی ایک کوشش بھی ہے اور اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہو تو بھی انداز بیان کی شوخی اور طرز گفتار کا مزاج ایسا دلچسپ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو ایک قلبی سکون، ایک روحانی اطمینان، اور ایک ذہنی مسرت کی لذت ملتی ہے اور اگر شعر میں یہی کچھ ہو تو بھی اس نے اپنا مقصد پورا

کر دیا۔ اس لیے کہ ذہنی سکون اور قلبی اطمینان بخشنا ہی بہتوں کے نزدیک شعر کا مقصد اور منتہا ہے وہ اگر خدا کا مذاق اڑاتے رہیں۔ گو اس سے ان کا مقصد قدرت خداوندی سے انکار یا توہین مذہب نہیں ہوتا بلکہ اس سے وہ غلط ڈھنگ سے ان چیزوں کو پیش کرنے والے سطحی زاہدوں اور واعظوں کی لفاظی کی قلعی کھولتے ہیں اور حقیقتاً ان چیزوں کی نہیں، ان چیزوں کو غلط عمل اور غلط رنگ سے پیش کرنے والے دو رکعت کے اماموں کی وہ تحقیر کرتے ہیں۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

پھر چھیڑ چھاڑ اور شوخی و ظرافت کے جو اشعار ہیں ان کا انداز خطاب اور طرز گفتار ایک خاص ڈھنگ کا ہے اور یہی انداز بیان ان کو دوسرے سخنوروں سے اچھا بناتا ہے چند شعر دیکھیے:

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

غالب کے کلام کا انداز خطاب، طرز گفتار اور شوخی شعر دہلی کے سماجی تکلف، وضعداری اور گفتگو کی شائستگی اور نستعلیق بات چیت کی غماز ہے۔ وہ تعلیم عجمی میں طاق اور وضعداری کے فن میں یکتا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ہر مذہب و ملت کے چھوٹے بڑے کو انس تھا اور غالب سے دو دو بچن کے ہونے میں ایک بات سمجھتا تھا۔ بھئی، واہ، اے، واہ حضرت، صد حیف، تمہیں کہو، کوئی بتلائے یہ سارے الفاظ ان کے زمانے کے جاگیرداروں اور طبقہ شرفا کے انداز خطاب اور تکلفات گفتگو کے مظہر ہیں۔ اس میں غالب کی اپنی شوخی طبیعت اور نئے ڈھنگ اور روش عام سے ہٹ کر لکھنے اور بات چیت کرنے کی فطرت نے اور بھی حسن اور دلچسپی اور کشش پیدا کر دی ہے۔ حد یہ ہے کہ غم و الم کے بیان میں بھی وہ اپنی طبعی ظرافت سے ایسا انداز اختیار کرتا ہے کہ غم غم نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں بھی ایک نشاطیہ لے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ خاص انداز فکر ہے جو ان کی شوخی انداز گفتار کہی جا سکتی ہے اور جو ان کو منفرد، ممتاز اور دلی قامت شعرا کی صف میں مقام بلند عطا کرتی ہے۔

یاز فتحپوری نے غلط نہیں کہا ہے کہ غالب نے نئی زبان پیدا کی، نیا لب و لہجہ اختراع کیا، نیا انداز بیان ایجاد کیا۔ اور جو کچھ کہا اس اعتماد کے ساتھ کہا۔ ایسی بلند آہنگی سے کہا، گویا وہ ایک کڑاکا تھا، ایک تیز روشن شہاب ثاقب تھا جس کے سننے اور دیکھنے پر دنیا محو ہو گئی۔" ؎

ہے دور فتادہ ہم شاہباز

اُستاد ——— اور ——— شاگرد

(مرزا اسد اللہ خاں غالب)　　　(منشی غلام اللہ صاحب بسمل)

نوٹ:- منشی غلام اللہ صاحب بسمل خلف منشی سرفراز علی کنبوہ ساکن بانس بریلی شاگرد مرزا غالب نے بھی اسی زمین میں بالکل اسی رنگ کا اتباع کرتے ہوئے ایک غزل کہی ہے۔ جو ہر لحاظ سے کامیاب تصور کی جاسکتی ہے۔ یہ غزل لکھ کر انھوں نے حق شاگردی خوب ادا کیا ہے۔ ہدیۃً پیشکش ناظرین کی جاتی ہے۔ میں پنڈت کیلاش ناتھ کول مِتکش کاشمیری کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے یہ دونوں غزلیں مہیا کرکے ایک بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ (مدیر)

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا!!

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا!!
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

شب وفورِ اشک سے گردوں کفِ سیلاب تھا
دورۂ چشمِ کواکب حلقۂ گرداب تھا!

واں حنابندی عناں گیرِ خرامِ ناز تھی!!
یاں تنِ کاہیدہ غرقِ اشکِ خونِ ناب تھا

واں رخِ پُر نور تھا صبحِ امیدِ زندگی
یاں ہر اک داغِ جگر خورشیدِ عالم تاب تھا

دیدۂ بے خواب کو شب تھا کسی کا انتظار
کان آہٹ پر رواں مژگاں سے خونِ ناب تھا

واں نگاہِ سرمہ آلودہ تھی گلچینِ بہار
موجزن یاں چشمِ تر سے خون کا سیلاب تھا

یاں دلِ شوریدہ کو سر پھوڑنے کا تھا خیال
زیرِ سر واں غیر کا زانو برائے خواب تھا

ساغرِ گل اب کہاں وہ شورِ قلقل اب کہاں
نغمۂ بلبل فسانہ جلوۂ گل خواب تھا!

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا!

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا!
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بے تاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا!
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے تاب تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

دیدۂ بے خواب تھا یاں ہم نے محوِ اختلاط
استراحت کے لئے واں بسترِ سنجاب تھا

حسنِ تمکیں آزما کو پاسِ خودداری وہاں
خانہ زادِ عشق کو ملحوظ یاں آداب تھا!

اُن کو پاسِ ننگِ دامن گیر مجھ کو پاسِ وضع
وہ اُدھر بے تاب تھے اور میں اِدھر بیتاب تھے

کیوں نہ جھکتی زاہدِ مغرور کی گردن اُدھر
خنجرِ خمدارِ قاتل صورتِ محراب تھا

شمع بزمِ عیش تھا واں خندۂ دنداں نما
اشک جو آنکھوں سے ٹپکا یاں وہ خونِ ناب تھا

ہو گیا بے ساختہ یوں آج سرگرمِ سخن
ایک مدت سے تو استجی کو دل بیتاب تھا

میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر
بسترِ سنجاب تھا نے بالشِ کمخواب تھا!

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب — ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا (غالب)

غالب داورِ محشر کے سامنے

فیچر

از جناب محی الدین فاروقی

صور کی مہیب اور ہیبت ناک آواز سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ مُردوں کی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ سب کے سب ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ "قیامت آگئی۔ قیامت آگئی" کا ہر طرف شور، اس ریلے میں میں بھی آگے بڑھا۔ قبروں سے جلدی جلدی سارے مُردے اس طرح نکل رہے تھے جیسے زلزلے کی پیشین گوئی سن کر گاؤں والے گاؤں چھوڑ رہے ہوں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں ایک قبر کے پاس سے گزرا اور دیکھا کہ قبر کا مُردہ ایسے سکون اور اطمینان کے ساتھ سو رہا ہے ؎

گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

لاش کا کفن مٹی کے اثر سے گل چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ کیا ہے جسے افراتفری کے عالم میں بھی قرار ہے۔ میرے قریب ہی دو آدمی گزرے ایک نے دوسرے سے کہا ؎

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ لاش میں حرکت ہونے لگی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس لاش نے ہوبہو غالب کی شکل اختیار کر لی۔

غالب کی چتون سے صاف غصّہ کا اظہار ہو رہا تھا اور انھوں نے بڑے ہی جلے ہوئے انداز میں کہا ؎

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

جب انھوں نے نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور انھیں پتھر نظر آئے جو سینکڑوں برس سے ان کی قبر کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ تو ذرا مسکراتے ہوئے گنگنانے لگے ؎

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

اب جو انھوں نے نظر اٹھائی تو غیر ہی کو بلکہ مجھے اور کئی خوش فکروں کو اپنی طرف گھورتے دیکھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور اوپر نظر اٹھا کر کہنے لگے ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ابھی ہم یہاں اس نظارے میں مشغول تھے کہ یکبیک آواز آئی۔ "میدانِ حشر میں چلو اور داورِ محشر سے اپنا فیصلہ حاصل کرو۔"

ہم بھی لپک کر پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ سب لوگ مراتب کے لحاظ سے کھڑے تھے ایک طرف عوام کا مجمع تھا گھس گھسا کر مجھے بھی اس مجمع میں آگے جگہ مل گئی۔ کہیں پیغمبروں کا گروہ تھا تو کہیں اولیاء اور صوفیاء کا۔ کہیں علماء کا مجمع تھا تو کہیں حفاظ کا۔ کہیں شعراء کھڑے تھے تو کہیں مضمون نگار حضرات اور ادیب۔ خدا کے نیک بندے جنت میں جا رہے تھے۔ باری باری اردو شعراء کی باری تھی۔ دو چار ناموں کے بعد آواز آئی "اسد اللہ خان غالب ولد مرزا عبداللہ بیگ خان حاضر ہو"۔ غالب آگے بڑھے اور سجدہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ آواز آئی "اس شخص کا نامۂ اعمال سناؤ۔" ایک فرشتے نے سجدہ کیا اور کہنا شروع کیا۔

بارالٰہا! اگر ہم اس شخص کا مفصل حال بیان کریں تو

وقت ختم ہو جائے مگر بیان ختم نہ ہو معبودِ حقیقی! اس نے اپنی دلچسپ شاعری کے ذریعہ لوگوں کو راہِ مستقیم سے بہکانے کی کوشش کی۔ میں صرف ان واقعات کو پیش کرتا ہوں جہاں اس نے جنت کا مذاق اُڑایا ہے پروردگارِ عالم! سب سے پہلے تو اس نے جنت کے وجود ہی سے انکار کیا اس نے کہا ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

ایک دوسرے موقع پر اس نے کہا ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک وقت وہ آیا جب اس نے جنت کے وجود کو تو تسلیم کیا لیکن اس کی اہمیت ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا ؎

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

اے معبودِ حقیقی! جب اس شخص پر یہ یقین ہے کہ اس نے جنت کے وجود کو مان لیا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ اوّل تو ہمیں پرواہ نہیں اور اگر کبھی اس کی خواہش کی ہے تو صرف شراب کے لئے۔ اس نے کہا ؎

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

ندا آئی: "غالبؔ"

غالبؔ۔ "پروردگارِ غالبؔ!"

ندا۔ "کیا تمہیں اس بیان کی صداقت پر یقین ہے؟"

غالبؔ۔ معبودِ حقیقی ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

ندا۔ یہ نہ سمجھو کہ تم کہاں ہو۔ یہ میرا انتظام ہے۔ اس میں دخل دینے کی کوشش نہ ہو۔

غالبؔ۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتا ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں...

ندا۔ ہاں! اس میں بھی میری مصلحت تھی۔

ندا۔ کیا تمہاری کوئی خواہش بھی ہے؟

غالبؔ۔ اے امیدوں کے بر لانے والے میری خواہش پوری کی جائے گی؟"

ندا۔ بیان کرو!

غالبؔ۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ندا۔ غالبؔ! ہمیں افسوس ہے کہ تم نے ہماری بخشی ہوئی ذہانت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ایک فرشتے نے آگے بڑھ کر سجدہ کیا اور کہا: "پروردگار! اس نے بس بس نہیں کیا اس نے لوگوں کو تلقین کی کہ بہشت کو دوزخ میں ڈال دو۔"

ندا۔ صاف صاف بتاؤ اس نے کیا کہا؟

فرشتہ ؎ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ندا۔ کیا اس نے یہ کہا۔

فرشتہ۔ جی پروردگار! اس نے کہا۔

ندا۔ تو اس نے لوگوں کو صحیح اطاعت کا راستہ دکھایا اس نے لوگوں کو بتایا کہ خالص اطاعت کے لئے بہشت وغیرہ کا خیال نکال دو۔ فرشتو! اس کو جنت میں لیجاؤ۔

فرشتے۔ بہتر ارحم الرحمٰن!

غالبؔ فرشتوں کی معیت میں یہ گنگناتے ہوئے آگے بڑھ گئے ؎

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا؟

شعرا کے مجمع میں سے نعرۂ تحسین بلند ہوا صدر کی آواز جو مسلسل آ رہی تھی بند ہو گئی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا صحن میں بچے ربڑ کا بھکنا بجا رہے تھے۔ ایک بچے کا بھکنا پھٹ جانے سے یہ شور ہوا تھا۔

زبان و بیان غالب

از:- جناب نعت مرقوش

بیانِ غالب رنگین ادا ہے! — قلم شاعر کا سجدہ میں جھکا ہے!

پئے تعظیم صف بستہ ہیں الفاظ — دلِ شاعر میں اِک طوفاں بپا ہے

عقیدت اُس سے ہر اہلِ نظر کو! — کہ وُہ فکر و نظر کا رہنما ہے

وُہ غالب وہ شہنشاہِ معانی!! — وُہ غالب جس کی عظمت غیر فانی

فصاحت اور بلاغت اللہ اللہ! — کہ دریائے سخن مانگے روانی

بہت استاد شہ تھے اور ہوں گے — مگر ہوگا نہ کوئی اُس کا ثانی!

ظرافت اُس کی فطرت کا تقاضہ — متانت اُس کے فکر و فن کا جوہر

محبت روح اُس کی شاعری کی — کہاں ہوں گے بھلا ایسے سخنور

زمانہ کِس لئے اُس کو مٹاتا — وُہ انساں تھا نہ تھا حرفِ مکرر

زباں اُس کی زبانِ زندگی ہے
بیاں اُس کا بیانِ آگہی ہے

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا (غالب)

مرزا غالب کا خط پنڈت نہرو کے نام

جناب فرقت کاکوروی

جانِ غالب۔ بین الاقوامی شہرت کے طالب، میاں جواہر لعل
خوش فکر و خوش خصال، جگ جگ جیو تا قیامت آبِ حیات پیو۔
سنو صاحب! امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد آئے ہیں اور اپنے ہمراہ
دو نسخے دیوانِ غالب کے لائے ہیں جو مجھے ابھی موصول ہوئے ہیں۔
ایک نسخہ علی سردار جعفری نے ترتیب دیا ہے۔ دوسرا عرشی رام پوری نے
مرتب کیا ہے۔ دونوں نے اخلاص و محبت کا حق ادا کیا ہے۔ میر
مہدی اور پنڈت کیفی بیٹھے ہیں، حقے کے کش چل رہے ہیں، ہجر و
فراق کے لمحات مل رہے ہیں۔ فضا میں دھواں چھک رہا ہے اور شیجوان
جھک رہا ہے۔ کر سکیوں میں آتش خانی ہے جس سے چلم کا چہرہ ارغوانی
ہے۔ ریختہ کا جب ذکر آیا تو مولانا آزاد نے بتایا کہ میں زبان کے
مسئلہ میں تقریر کر آیا ہوں اور معاملات نہرو کے سپرد کر آیا ہوں،
وہ سیاست کے مردِ میدان ہیں، علم و ادب کے پاسبان و نگہبان ہیں،
اردو ہندی کے مسئلہ میں یک قالب و دو جان ہیں۔ اب حسب مراتب
دونوں مجلسیں لگیں گی اور دونوں ہی کھچڑیں پکیں گی۔ سنتا ہوں کہ میں
مکر کا نام تم نے آکاش وانی رکھا ہے۔ اس آزاد کی تقریر کو دخترِ
افراسیاب بنا رکھا ہے۔ اچھا اسانگا رکھا ہے۔ نہ بتلاتے ہیں نہ سناتے
ہیں۔ نئی نویلی دلہن بنائے سٹیج پر رکھتے ہیں۔ تم تو وزیر با تدبیر ہو،
علم و ادب کی درخشاں تحریر ہو، خود روشن ضمیر ہو، پوچھو تو کہ وہ
ڈالڈا کی چیز پال میں کیسے ڈالی گئی اور آزاد کی سالگرہ کی تقریب اس
سے کیوں خالی گئی۔ مولانا کہتے ہیں کہ ان کی تقریر کی تائید تم نے کی
تھی اور اپنی رائے ان کے حق میں دی تھی۔ آخر وہ دونوں تقریریں ہوا
میں کہاں گم ہو گئیں۔ میں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہلوایا ہے
کہ انہیں تلاش کرائیں اور آکاش میں پتہ لگائیں کہ کہاں ہوا میں معلق ہیں۔
تحقیق جاری ہے مگر عقل حاری ہے کہ وہ کدھر۔ صدا بصحرا تو نہیں
ہو گئیں؟

کل جبریلِ امین آئے تھے اور ایک نئی خبر لائے تھے۔ کہتے تھے کہ
جو لوگ عالمِ ارواح میں آ رہے ہیں، وہ سب خطا وار اُردو کو عالم
برزخ میں لا رہے ہیں۔ وجہ پوچھی تو بتایا کہ زمین والوں پر اب
زبان بار ہے، اس کے لب و لہجہ سے اکثریت بیزار ہے۔ ہندوستانی
عوام اس سے متفق نہیں کہ عرش کی چیز فرش پر دیکھیں اور یہ خاموشی اور
سکوت کھینچیں۔ جو زبان سن و تو کی تخصیص باقی نہ رہے اسے کیونکر
کوئی سینے سے لگائے رکھے۔ جب ساری خلقت کی زبان ایک ہو گئی
تو محمود و ایاز کی تخصیص کہاں رہی؟ جبریل امین نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان
میں یہ کام تیزی سے ہو رہا ہے بلکہ کوئی خفیہ معاہدہ ہند و عالمِ ارواح
میں ہوا ہے۔ جس کی حقیقت حامیانِ اُردو پر کھل گئی ہے اور انہیں
اس کی سن گن مل گئی۔ اسی سے ہندوستان سے عالمِ بالا جانے
والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے ایک کے پیچھے ایک لگا ہوا ہے۔ تقسیم
کے بعد بڑے بڑوں میں حسرت، بیخود، یگانہ، سیفی، مجاز، کیفی
اور مخمور پہنچ چکے ہیں۔ اور اب جو آنے والے ہیں وہ بھی پا بہ
رکاب ہیں اور سفرِ آخرت کو بیتاب ہیں، پاسپورٹ بنوا لیے
ہیں اور اپنا بوریہ بستر بندھوا چکے ہیں۔ ویزا فوراً ہی مل
جاتا ہے سو فرسٹ میں چوں و چرا کوئی یوں نہیں کرتا ہے کہ جو جاتا
ہے پلٹ کر نہیں آتا۔ مولانا آزاد کے بعد بزرگ کو دوسرے
بلوایا گیا ہے اور بعجلت دیگر کاموں کے انہیں اس کام پر بھی لگایا گیا
ہے۔ وہ آ دلی کیے گئے ہیں، جن صوبے گئے ہیں، یہ کام محض دفتری بنا
چکے ہیں۔ ان کے آنے پر صوبوں کو حکم ہوا ہے کہ کام تیزی سے کیا
جائے ورنہ سستی برتنے والوں کو نذرِ زنداں کیا جائے گا۔ دفتروں
میں کام والے دل جمعی سے کام کر رہے ہیں اور بڑے اور چھوٹے
سب ہی نام کر رہے ہیں۔ نئے الفاظ ڈھل رہے ہیں اور اصطلاحات
کے سوتے اُبل رہے ہیں۔ جو جا چکے ہیں اپنے پاسپورٹ اور

ویزا پا چکے ہیں۔ جن کا ویزا تیار ہے ان کا مرکز انتظار ہے۔ نئی آزادی کے ساتھ پرانی زبان نہ ہو تاکہ کمخواب میں ٹاٹ کا گمان نہ ہو۔

پاکستان میں بنگالی اور پنجابی والے جھگڑ رہے ہیں اور سندھ والے سندھی کے لئے اکڑ رہے ہیں۔ مگر وہاں کی اصطلاحات پردیسی کی زبان کے محاورات غائب ہیں۔ جب عربی ملائکہ کی زبان ہے اور عربی رسم الخط پر فرشتوں کا ایمان ہے تو اسے عالم ارواح میں کیوں نہ مہو بچایا جائے اور اسے روحانیت کا جامہ کیوں نہ پہنایا جائے۔ ہندوستان کے کئی صوبوں میں کام مکمل ہو چکا ہے۔ ڈھانچہ بدل چکا ہے۔ ادھر انجمن ترقی اردو اور تعمیر اردو دو روڑے اٹکا رہی ہے اور اس کی بقا کی خاطر دھکے کھا رہی ہے۔ ان میں سے ایک کو جس نے ذرا زیادہ ہاتھ پاؤں نکالے تھے اور زمین پکڑنے کے نئے گوشے نکالے تھے اسے وظیفہ دیا گیا تھا اور اس کا منہ بند کیا گیا تھا۔ مگر وہ اب بھی تڑپ کے جاتی ہے اور اپنی بساط بھر دوڑے جاتی ہے۔ اس کی للو کون روکے اور پیسے کے بل بوتے ختم کراتی ہے۔ میں نے ازرہ دل لگی جبریل امین سے پوچھا کہ یہ اتر پردیش سے کیوں نکالی گئی۔ کس جرم میں اس پر کلی ڈالی گئی؟ بولے صاحب جس زبان کی ٹکسال پورب سے پچھم جائے اور جو عالم ارواح کی زبان پر عمل درآمد کروائے وہ اتر پردیش میں جگہ کیسے پائے؟ میں نے ہنس کر پوچھا کہ شاعروں کا کیا خیال ہے اور ان کا کیا احوال ہے؟ بولے شاعروں میں بڑی بازی ہوتی ہے۔ واہ واہ کی آتش بازی چھٹتی ہے۔ مصرعوں کو زور زور سے اٹھایا ہے سبحان اللہ کا ایک طوفان بپا کیا جاتا ہے۔ اس دیش کا ایک خاص مزاج ہے۔ یہاں صلح و آشتی کا راج ہے۔ یہاں کے لوگ اہنسا کے قائل ہیں اور جھگڑوں کے تیر چلاتے ہیں اور ضبط و تحمل سے دلوں کو گرماتے ہیں اور اسی بڑے بڑے معرکوں میں دشمنوں کو نیچا دکھاتے ہیں۔ اور کروڑوں ادھر سے پانی جاتا ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کی انفرادیت ہے، خوشی اس کی خاصیت ہے۔ ہر فرد اپنی زبان کا خالق ہے اور بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ خود اپنی اصطلاحات ڈھالتا ہے اور اپنی رفتار و گفتار کو پالتا ہے۔ چونکہ سر پر خود ساختہ تاج ہے اس لئے کسی کا دست نگر ہے نہ محتاج ہے۔ سلیقہ میں

جب زبان کا شاعر ہوتا ہے اپنے کلام سے خط اٹھاتا ہے۔ جب کلام سناتا ہے تو سامعین پر قبرستان سناٹا چھاتا ہے۔ نہ آنے کی خوشی نہ جانے کا غم۔ نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا الم۔ ہر شعر عرفان افزا اور ہر بند خموشی پر فدا۔ حاضری میں غیر حاضری کا مزا آتا ہے اور ہر مقفر خود بخود اپنے کو خاموش پاتا ہے۔ میں جبریل امین کو ان کے اس تجزیے پر داد دی۔ مگر اسی کے ساتھ اس خبر پر مبارکباد دی اور کہا پھر عالم ارواح میں ایسی زبان کو بھیجنے میں اتنی دیر کیوں ہے اور یہ آپس میں دشمنی اور بیر کیوں ہے؟ بولے زیر اور زبر کا سوال ہے اور نہ اس کے رہنے اور نہ رہنے میں ٹال مٹول ہے۔ پانچ سال میں یہ مصیبت ٹل جائے گی۔

اس وقت تک نئی پود تعلیمی اداروں سے پڑھ لکھ کر نکل گئے گی۔ نئی زبان میں شلوک بنیں گے اور وہی مقصد زندگی بنیں گے۔ زبان صرف بولی جائے گی۔ اشاروں میں تولی جائے گی۔ میں نے کہا اچھا اچھا سمجھ گیا۔ بات کی تہہ کو میں پہنچ گیا۔ حمیدہ سلطان اور آل احمد دونوں کو یہ خط دکھا دو اور جن جن کو اس سال تبلیغ رہے ہو ان کا نام و پتہ بتا دو۔ نام نہ یاد ہوں تو نمبر ہی لکھوا دو۔ مگر خط کی رسید بھی بھجوا دو۔

تمہاری عافیت کا طالب
اسد اللہ خان غالب
مورخہ ۲۷، فروری سنہ ۱۹۶

غالبؔ جدید شعراء کی ایک مجلس میں

(صفحہ ۴۳ سے آگے)

کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول
(باقی شعراء یک زبان ہو کر) بول کبوتر بول کبوتر بول کبوتر بول۔ (اس شور و غل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے نکل جاتے ہیں)۔

تضمین {نذرِ غالبؔ}

ازجنابِ حکیم منظورؔ

ہم میں پہلا سا اب وہ حال کہاں | وُہ جمالِ مئے جمال کہاں!
دل میں وہ شوقِ لازوال کہاں | "وہ فراق اور وہ وصال کہاں"
"وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں"

کیوں کوئی داستانِ درد سُنے | ہے کسے ہوش، زخمِ دل دیکھے
کون تصویرِ غم میں رنگ بھرے | "فرصتِ کاروبارِ شوق کسے"
"ذوقِ نظارۂ جمال کہاں"

جو رہے جا بجا چُپ میں رہ نہ سکا | سچ ہے اُلفت کا حق ادا نہ ہوا
مجھ سے بارِ غمِ وفا نہ اُٹھا | "دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا"
"شورِ سودائے خط و خال کہاں"

حُسن کی بندگی میں یکتا تھے | ہم بھی شیدا تھے عالمِ دل کے
جس کو مستیٔ جنون کہیئے | "تھی وہ اک شخص کے تصور سے"
"اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں"

سنگِ در سے ترے جُدا ہونا | داغِ بے مہریٔ جنوں دھونا
آبروئے غمِ وفا کھونا | "ایسا آسان نہیں لہو رونا"
"دل میں طاقت جگر میں حال کہاں"

اپنی آواز کو دباتا ہوں | جو حقیقت ہے وُہ چھپاتا ہوں
دل کے کعبے میں بُت بناتا ہوں | "فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں"
"میں کہاں اور یہ وبال کہاں"

اعتبارِ حیات کیا غالبؔ | دیکھیے کب ہوا نتہا غالبؔ
کیا دُعا اور کیا دوا غالبؔ | "مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ"
"وُہ عناصر میں اعتدال کہاں"

اُستاد غالبؔ ہمیشہ غالبؔ رہیں گے!

از جناب پرتھوی کرشن سمیلپوری

حسن و جمال کی طرح شاعری بھی خالقِ بخشش جبینہ کی ایک دین ہے۔ عقل و خرد کی یہ روشنی۔ چشم و دل کا یہ نور۔ اور دل و دماغ کا یہ سرود۔ وہ جسے جتنا چاہے عطا فرما دے۔ چنانچہ اربابِ دانش دُنیا کے بلند فکر شعراء کی انہی خاص صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اُنہیں نہ فقط دنیا کی عظیم ترین ہستیاں، بلکہ پیغمبر اور ولی بھی مانتے چلے آ رہے ہیں۔ اور ایسے ہی عظیم ترین شعراء کرام کی صفِ اول میں حضرت مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کو تشریف فرمائی کا فخر حاصل تھا۔

ہندوستان کے آخری مغل تاجدار اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر اردو ادب کے سرپرست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اثر انگیز شاعر بھی تھے۔ اُن کے محلات میں آئے دن مجالس مشاعرہ منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ جن میں اُس دَور کے بڑے بڑے استاد شعراء کے علاوہ بادشاہ سلامت خود بھی اپنے کلام بلاغت نظام سے سامعین کو محظوظ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ کی انہی ادبی حوصلہ افزائیوں کی بدولت ان کے عہد کا شہر دلی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایک قابلِ دید مرکز بنا ہوا تھا۔ اور اُسی عہد زریں میں جب اُستاد غالب کی شاعری ایک کافرادا حسینہ کی طرح اپنے بہترین بناؤ سنگھار کے ساتھ اہالیانِ دلی کے روبرو جلوہ افروز ہوئی تو راجدھانی میں اُس کے حُسن و جمال کی دھومیں مچ گئیں۔

غالب کی اس مقبولیت سے اُستاد شاہ حضرت محمد ابراہیم ذوقؔ کا ماتھا ٹھنکا۔ اُنہیں اپنا ارفع ترادبی سنگھاسن ڈولتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ اب شاہی مشاعروں میں غالب کی شمولیت کو اور زیادہ دیر تک نہ روکا جا سکے گا۔

اِس لیے اُنہوں نے استاد غالبؔ کے خلاف پہلے ہی سے سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیے ـــــ شہر میں جہاں غالبؔ کی شاعری کے بے شمار مداح موجود تھے۔ وہاں اُن کے اَدبی حاسدوں کے وجود سے بھی انکار محال تھا۔ لیکن جس طرح گلاب کے پودے کی کٹیلی شاخیں اپنے بے شمار کانٹوں کا سہارا لے کر اپنے دَرمیان کلیاں چٹخنے اور پھول کھلنے کے عمل میں رخنہ ڈالنے کی ہر کوشش میں ہمیشہ ناکام و نامراد رہ جاتی ہیں ـــــ ٹھیک اسی طرح غالبؔ کے رقیبوں کی تمام تر مخالفانہ چالوں کے باوجود غالبؔ کے گلشن شاعری میں حسین کلیاں بھی پھوٹتی جا رہی تھیں، خوش نما پھول بھی کھلتے جا رہے تھے۔ اور بادِ بہاری کے لطیف جھونکے ان کی خوشبو اُڑا اُڑا کر شاہی محل میں فردوش بادشاہ ظفر کے دل و دماغ کو معطر بھی فرما رہے تھے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ یومِ سعید بھی آ گیا۔ جب دلی کے اہلِ ادب حضرات کی پیشن گوئی کے عین مطابق استاد غالبؔ شاہی مشاعرہ میں شمولیت کیلئے شاہی محلات کے دیوانِ خاص میں جا پہنچے ـــــ راجدھانی کے روسا، اُمراء، شہنشاہ کے درباری اور اُس دَور کے بڑے بڑے قادر الکلام شعراء کرام، اطلس و کمخواب کے گاؤ تکیوں کے سہارے اپنے اپنے درجے کے مطابق اپنی اپنی مخملیں گدیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ جب حسبِ دستور شاہی مشاعرہ کی کرسی صدارت کو زینت بخشنے کی غرض سے شہنشاہ ظفر کی تشریف آوری پر وہ اُن کے استقبال کیلئے اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور شاہ کے تخت زرنگار پر رونق افروز ہو چکنے کے بعد ایک انتہائی پُر وقار ماحول میں جب مشاعرہ کا آغاز ہوا تو شعراء کرام نے اپنے استاد

کلام سے جہاں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا کر رکھ دیئے، وہاں قلعہ معلیٰ کے اُس تاریخی شاہی مشاعرہ کا یہ پہلو انتہائی افسوسناک بھی تھا۔ کہ اس میں استاد غالبؔ نے جب یہ شعر پڑھے کہ ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

تو نہ صرف یہ کہ کچھ آزاد رو شعرا کے علاوہ اُستاد ذوقؔ یا اُن کے دھڑے کے کسی شاعر نے غالبؔ کو داد ہی نہ دی بلکہ ذوقؔ کے کچھ خوشامدیوں نے اُن کے مقطع پر اُن کے خلاف یہ آوازہ بھی کس دیا کہ غالبؔ صاحب! شاہی مشاعرہ میں آپ کی یہ خودستائی ہرگز مناسب نہیں۔

اپنے حاشیہ بردار دل کے اس آوازہ پر اُستاد ذوقؔ اور ان کے دھڑے کے شاعر تو خوش ہو گئے ہوں گے۔ لیکن سامعین میں ایسے سخن فہم اربابِ ذوق کی بھی کمی نہ تھی۔ جو اُستاد غالبؔ کے اس مقطع کے علاوہ اُن کی غزل کے اس شعر کی حقیقت کو بھی بہت اچھی طرح سے سمجھتے تھے کہ ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

چنانچہ جس طرح اُستاد غالبؔ نے اپنے ان اشعار میں کچھ خدالگتی باتیں کہہ کر اپنے بدخواہوں کو برانگیختہ کر دیا تھا۔ اُسی طرح ان کے رقیبوں نے بھی اُن کے خلاف آوازہ کس دیا۔ لیکن وہ آوازہ خوددار غالبؔ کے جگر میں تیر کی طرح پیوست ہو کر رہ گیا۔ وہ شاہی مشاعرہ سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اور جب ایک دن اُن کے ایک بزرگ نے اُن سے یہ دریافت کیا کہ اے میاں! قلعہ معلیٰ کے شاہی مشاعرہ میں اس روز تم نے کیا خاک اڑائی؟ تو غالبؔ نے انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے بزرگوار!

وہاں بیشتر شعرا خاک اُڑانے والے ہی تو تھے۔

یوں تو تہذیب و شائستگی کے دائرہ تک محدود کسی بھی دور کے شعراء کی باہمی چوٹ بازی اکثر اوقات ادبی سرگرمیوں میں فروغ ہی کا باعث ثابت ہوتی رہی ہے لیکن شاہ ظفر کے شاہی مشاعرہ میں غالبؔ کی مخالفت کا اصل موجب وہ احساسِ کمتری تھا جو ہر عہد کے حکمرانوں کے درباروں میں منصب یافتہ شخصیتوں کو ہمیشہ فکرمند بنائے رکھتا چلا آرہا ہے۔ اور اُسی احساسِ کمتری کے پیشِ نظر وہ کسی ایسے شخص کو کبھی بھولے سے بھی اپنے حکمرانوں کے نزدیک تک نہیں پھٹکنے دیتے۔ جس سے انہیں اس کی خداداد صلاحیتوں کے پیشِ نظر کبھی مات کھا جانے کا ذرا بھی اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔

لیکن اُستاد غالبؔ اُستاد ذوقؔ کا شاہی منصب چھین لینے کے تو کبھی تمنائی نہ تھے۔ وہ تو پہلے ہی سے یہ فرما چکے تھے کہ ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

لیکن اس کے باوجود ان کے خلاف ادبی سازشیں بھی چلتی رہیں اور راجدھانی کے گھر گھر میں ان کی غزلیں بھی گونجتی رہیں۔ اور بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب اُداس بادشاہ ظفر کو خوش کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہو جانے پر استاد غالبؔ کے ان چند اشعار نے انہیں جوش میں لا کر رکھ دیا کہ ؎

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے۔ لیکن!
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ایک مغنیہ نے استاد غالبؔ کے یہ اشعار کچھ اس انداز سے بادشاہ کے سامنے گائے کہ وہ فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھے۔ اور اس چہرے پر راحت و انبساط کی مسکراہٹیں رقص کرنے

لگیں۔ شاہی محلات کے اعلیٰ موالی کلام غالب کا یہ مسحور کن معجزہ دیکھ کر عش عش کر اٹھے۔ بادشاہ نے نہ فقط اس مغنیہ ہی کو مال و زر سے نہال کر دیا بلکہ اس کے بعد انہوں نے غالب کی عزت افزائی کے لئے ایک خاص دربار کے انعقاد کا حکم صادر فرمایا اور استاد غالب کو شہر سے ایک شاہانہ جلوس میں لا کر سرِ دربار انہیں خلعت فاخرہ اور خطاب سے سرفراز فرما کر اپنی اس انصاف پروری، سخن فہمی، ادب نوازی اور فرض شناسی سے ہندوستان بھر کے دانشوروں کے رُوبرُو یہ حقیقت واضح کر گئے و کھ دی کہ بلاشبہ استاد غالب ہی ان کے عہد کے شعرائے کرام کے تاج الشعراء ہیں۔

اور آج جبکہ ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی استاد غالب کی صد سالہ برسی کی دھومیں مچ رہی ہیں۔ ایک بار پھر سے یہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ استاد غالب نہ فقط اپنے ہی زمانہ کے تمام شعرائے کرام پر غالب و حاوی تھے۔ بلکہ وہ اپنے اس شعر کی روشنی میں زمانۂ حال و مستقبل کے شعراء پر بھی ہمیشہ غالب ہی رہیں گے کہ :-

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نامۂ غالب

یوں تو اردوئے معلیٰ مرزا کے خطوط کا مجموعہ ہے لیکن انہوں نے نامہ اور نامہ بر سے متعلق کچھ بڑے مزے کے اور چٹکیلے اشعار لکھے ہیں جو پیش ہیں۔ (مدیر)

مگر لکھوائے کوئی اُن کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کے قلم نکلے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو!
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے!

دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر!
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے!

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں!

کی تصویر سرِ نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھُل جائے کہ مجھ کو حسرتِ دیدار ہے

نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا!

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا غالب
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا!

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پُوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دِکھلا دُوں
انگلیاں فگار اپنی نامہ خون چکاں اپنا

مرزا غالب کی شاعری میں ترقی پسندانہ عناصر

از جناب موتی لال کپور

ماحول اور وقت تخیل اور اپج کو ہمیشہ متاثر کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہر دور کے مشاہیر کی تحریروں میں اُن حالات اور واقعات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ جس میں سے انہیں گذرنا پڑے۔ شعرائے کرام چونکہ وقت کے عکاس ہی نہیں بلکہ قوموں کی عقل اور نفس و روح کے خالق ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کا کلام فی الواقع ایک تواریخی اور تمدنی دوبہ رکھتا ہے۔

عظیم مغلیہ سلطنت کے آخری ستون سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ کی فرمانروائی اور حشم وجاہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہند کے ہر ریاستی چوراہے پر حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے نیم مشرقی و مغربی راجاؤں اور نوابوں کے دربار اور اُن کی انگریز پرست شان و شکوہ۔ ۱۸۵۷ء کا عالم آشوب زمانہ وہ حادثات ہیں جو شاعر تو کیا ایک معمولی ذہن و دل کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھے۔ پھر یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دورِ آخر کے معاشرے کی اس صف کے مرزا غالب میر کارواں تھے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرزا غالب کی بیشتر زندگی عشرت اور تنگدستی میں گذری۔ لیکن وہ اس کے باوجود یا تو بادشاہوں کی محفلوں میں رہے یا اُس طبقے سے تعلق رکھا جسے عُرفِ عام میں "اعلیٰ" کہا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اُن مادی دُشواریوں سے دوچار نہ ہوئے جن کا ہر محنت کش کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اُن کے کلام میں ترقی پسندانہ نوع کا مواد بہت کم ملتا ہے۔ اس کے برعکس اُن کی شاعری کا بڑا حصہ ساغر و مینا، عشق و محبت، سوز و درد، ناصحانہ فقرہ بازی، محبوب کے ظلم و ستم اور عاشق کی زبوں حالی اور مظلومی کی داستان بن کے رہ گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فلسفۂ حیات کا عنصر بھی اُن کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جو سوا سو سال کے بعد بھی آج کے انسانی قلب و فطرت کی غمازی کر رہا ہے۔ عشق و محبت، سوز و گداز، غم و اندوہ، ازل سے ابد تک ابنِ آدم کی جاگیر رہی ہے اور ان کی صحیح عکاسی بذاتِ خود ایک ترقی پسندانہ فعل ہے۔

دورِ گذشتہ میں اردو ادب تنقیدی سرمایہ میں ہمیشہ مُفلسی کا شکار رہا ہے۔ محض اسی لئے مرزا کا کلام ذہن و دل کے ساتھ ہمارے معاشرے کی عکاسی نہ کر سکا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ انسان کی مادی قدروں کو اُجاگر نہ کرتے۔

مندرجہ بالا اسباب کے باوجود ہمیں ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو آج بھی ترقی پسندانہ تقاضوں کو پورا کرتے ہیں ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں۔

ظاہر ہے کہ وہ متعدد مرحلوں پر ان راہبروں سے روشناس ہو چکے ہوں گے جو منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی کسی اور راستے پر چل پڑتے ہیں۔

امیری اور غریبی خدا کے ہاتھ سونپ کر دیندار الگ ہو گئے۔ لیکن مرزا غالب اس غیر مساویانہ طرزِ نظام کو للکارے بنا نہ رہ سکے ؎

یارب تو کجائی کہ بماز رندہی
آشفتہ چرائی کہ بماز رندہی
نے لے نہ غالبی و نے لے رحمی
بے مایہ چرائی کہ بماز رندہی

خدا کا ایک منظورِ نظر فرقہ جو اپنی گناہ آلود زندگی کے باوجود ہماری مجلسی ہستی پر خدائی اختیارات رکھتا ہے۔ جو ایک لامحدود قوت اور بھولے عوام کے درمیان اپنے آپ کو ایک پل ظاہر کرتا ہے جو انسان کی عظمت اور اس کی برتری کو کم مائیگی کا سبق دیتا ہے۔ جو معصوموں کو اس لئے قابلِ تعزیر گردانتا ہے کہ وہ انصاف کے دعویدار ہوتے ہیں۔ جو واعظ اور ناصح بن کر ظلم وجدل و فرقہ واریت کی آگ کو ہوا دیتا ہے۔ جو اخلاق کے واسطے دے کر خود پرُ معصیت زندگی بسر کرتا ہے۔ اُن ہی کے متعلق غالب فرماتے ہیں ؎

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ؟
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

"مذہبِ انسانیت" غالب کا مسلک رہا ہے۔ وہ اس انسان سے تنگ آکر فرماتے ہیں جو بورژوائی تمدن کی پیداوار ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

فنی ناقدری اور ناشناسی سے ہر اہلِ قلم کو جو مالی صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ مرزا غالب ان سے ہمیشہ دوچار رہے۔ غمِ جاناں کبھی کبھی شعروں کی شکل میں پھوٹ پڑتا ہے ؎

بے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزی سامراج کی بربریت اور جبر و استبداد کی داستان کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ مرزا ان دنوں دہلی میں اپنی عمر کے آخری مراحل طے کر رہے تھے۔ آنکھوں کی بصارت سے محروم ہو چکے تھے اور سماعت بھی کم دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی غمِ دوراں کی ہلکی سی صدائے بازگشت انہیں اپنے گھر کے قید خانے تک پہنچ جاتی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا

کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

بس کہ فعالِ ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

گاہ جل کر کیا کئے شکوے
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کئے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

ہر مجبور اور محنت کش آدمی پر تنگ معیشت کے با وجود پنڈت اور مولویوں کی اجارہ داری نے روزہ، برت، دان اور سخاوت کے جو بوجھ ڈال رکھے ہیں ان کو اٹھا کے زیست کی کٹھن منزلوں کو عبور کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنی موت۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

افطار صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

خدائے مطلق کی جلوہ گری پر کتنا بھر پور تمسخر ہے، جو اپنی بے پناہ قوت اور موت و حیات کا مالک ہونے پر بھی اپنا مقام معیّن کروانے میں قاصر ہے۔ جو ہر جگہ ہے اور پھر کہیں پر بھی نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

واعظ شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو

غرضیکہ یہ عظیم شاعر اور نثر نگار، اُردو زبان کا محسن اور خالق، عدیم المثال شخصیت کا مالک اور خوش مزاج اور پُرگو، لطیفہ سنج اور آزاد منش گلستانِ شاعری اور اردو ادب میں وہ پھول کھلا گیا ہے جس کی مہک ہزار ہا سال تک ہماری روح اور دماغ کو معطر کرتی رہے گی۔ سر عبدالقادر نے سچ ہی کہا ہے کہ "اگر میں مسئلہ تناسخ کا قائل ہوتا تو غالب کی رُوح شاعر مشرق علامہ اقبال کے پیکر میں سمجھتا"۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

از جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

غالب پھر اس دُنیا میں (طنزیہ)

جب میں اِس دُنیا میں تھا تو بے چین ہو کر ایک بار میں نے کہا تھا:۔

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آج موت کی گہری نیند پھر اچٹ گئی۔ کیا نیند کیا موت" دونوں میں کسی کا اعتبار نہیں۔ جب زندہ تھے تو زندگی کا رونا تھا۔ اور موت کی تمنا تھی۔ میں نے کہا تھا:۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

شمع اور سحر کا کیا ذکر۔ میں نے تو کھلی کھلی بات یوں کہی ہے:۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

لیکن ذوقؔ نے اس سے بھی زیادہ لگتی ہوئی بات کہی تھی۔ وہ نہ جانے یہ شعر کیسے کہہ گئے تھے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہاں تو میں کہاں ہوں۔ ابھی میرے حواس درست نہیں لیکن یہ زمین اور یہ آسمان تو کچھ جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔ لوگوں کو کس طرف بڑھتا ہوا دیکھ۔ آ ہوں میں بھی انہیں کے ساتھ ہو لوں۔ ؎

"پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

اب ان راستوں پر پالکیاں جاتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ گھوڑوں کی گاڑیاں چل رہی ہیں۔ لیکن ان کی شکل صورت بالکل بدلی ہوئی ہے۔ آنکھوں کے سامنے بیسیوں ایسی گاڑیاں بھی گزر گئیں۔ جن میں کوئی جانور جُتا ہوا نہیں تھا۔ سنا ہوں کہ لوگ انہیں موٹر کار کہتے ہیں۔ ان کل پُرزوں سے چلنے والی گاڑیوں میں تیزی اور بھڑک تو بہت ہے لیکن پُرانی سواریوں کی بات ان میں کہاں۔ خیر یہ تو ہونا تھا۔ آج سے نہ جانے کتنے برس پہلے جب میں اس دنیا میں تھا" زمانہ کروٹ بدل چکا تھا پھر کا پلٹ آنکھوں کے لئے نئی چیز ہو اور دل و دماغ کو بھی حیرت میں ڈال دے لیکن میری آنکھوں نے تو اسی وقت جب پچھلی زندگی پائی تھی" وہ وہ انقلاب دیکھے تھے کہ اب کیا کہوں" حیرت کروں اور کس بات پر کروں۔ بچپن اور جوانی میں قلعہ کے رنگ ڈھنگ کو دیکھا تھا۔ مغل دربار کی جھلملاتی ہوئی شمع

"داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی"

شمع پھر بھی ایک نیا رنگ پیدا کر رہی تھی۔ شہر کے شریفوں اور رئیسوں کی زندگیاں دیکھی تھیں۔ دُور دُور تک سفر گھوڑوں پر، بہلیوں پر، پالکیوں پر اور ڈاک گاڑیوں پر طے کیا تھا۔ پھر ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا" غدر کیا ہوا قیامت آ گئی۔ اس کے بعد پچھلی ہی زندگی میں ریل کی سواری پر دلّی سے کلکتہ کا لمبا سفر طے کیا۔ معلوم نہیں کلکتہ کی شان اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہو گی۔ اسی وقت یہ شہر دولہن بنا ہوا تھا جس کی یاد سے اب بھی تڑپ اٹھتا ہوں:۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اور یوں تو نہ کچھ رونق میں رکھا ہے نہ اجڑی حالت میں رکھا ہے۔ نہ صرف آبادی میں نہ ویرانے میں، پھر بھی جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے غنیمت ہے:۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

انسان جب زندگی کی مصیبتوں سے پریشان ہو جاتا ہے تو اسے
دنیا چھوڑنے کی سوجھتی ہے۔ اپنے کو دھوکا دینے اور غلط راستہ
پر چلنے کو اکثر لوگ خدا کی تلاش یا سچائی کا پا جانا سمجھتے ہیں۔
لیکن اس حقیقت کی بھی حقیقت مجھے معلوم ہے۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
جب پا نہ سکے اُس کو تو آپ اپنے کو کھو آئے

دنیا کو چھوڑ کر تو پیغمبر بھی کچھ نہیں ہوتا۔

– میں زندہ ہوں یہ کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

میں اپنے خیالات کی دھن میں کہاں نکل آیا۔ یہ تمام چہرے یہ
مکانات، یہ آبادی نئی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اور پرانی بھی۔ اجنبی
بھی اور مانوس بھی۔ وہ سامنے دھندلکے میں لال قلعہ نظر آ
رہا ہے۔ کچھ دور جامع مسجد کے برج اور مینار نظر آ رہے ہیں۔
میں دلی میں ہی ہوں۔ ہائے دلی! وائے دلی!!

اس بازار کی شان تو دیکھنے کی چیز ہے۔ چاندنی چوک!
اچھا یہ وہی چاندنی چوک ہے جو بار بار لٹا اور بار بار آباد
ہوا۔ اجڑا اور بسا۔ اس کا نام تک نہیں بدلا۔ یہاں تو نئی
زندگی کے شور و پکار میں بھی، یہاں کی نئی آوازوں میں بھی
پرانے نام کان میں پڑ رہے ہیں۔ کوچہ بیلیان، کوچہ بلیماران
ان دو محلوں میں میرا برسوں قیام رہا ہے۔ بہار آتی ہے اور
چلی جاتی ہے لیکن باغ وہی رہتا ہے۔

اس بازار میں اس دوسری دنیا سے پلٹ کر کیا خریدیا
جب زندہ تھے تبھی یہ حال تھا کہ:۔

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

لیکن اس طرف کچھ کتاب بیچنے والوں کی دکانیں ہیں،
کتابوں کی دنیا مُردوں اور زندوں دونوں کے بیچ کی دُنیا
ہے۔ یہاں ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ "ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے
ہیں"۔ چلیں ذرا کتابوں کی اس خیالی دنیا کی سیر کریں۔
وہ ایک طرف الماری میں کوئی نہایت اچھی اور قیمتی کتاب
رکھی ہوئی ہے۔ جلد تو دیکھو کیسی خوبصورت ہے۔ سنہرے
حرفوں سے کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اس کے برابر چھوٹی چھوٹی
کتابیں دیکھنے میں نہایت نظر فریب معلوم ہوتی ہیں۔ "ارے
بھئی یہ ذرا سامنے لگی ہوئی کتابیں تو اٹھا دینا" وہی جو سامنے
کے تختے پر الماری میں لگی ہوئی ہیں۔ چھپائی اور لکھائی
کے یہ کھیل پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ دیوانِ غالب، دیوانِ
غالب، دیوانِ غالب، مرقعِ چغتائی!! میری آنکھیں کیا دیکھ
رہی ہیں۔ برلن اور ہندوستان کے کئی شہروں سے یہ
کتابیں نکلی ہیں۔ کیوں بھئی ذوق اور مومن، ناسخ اور
آتش، میر اور سودا یہ سب غالب سے زیادہ مشہور تھے
ان کے کلام تو اور ٹھاٹ سے چھپے ہوں گے۔ ذرا انہیں بھی
دیکھوں۔ کیا کہا؟ صرف غالب کے دیوان اس اہتمام سے چھپے
ہیں۔ پھر کیا کہا؟ آج غالب کے نام کا سارے ہندوستان
میں شور ہے۔ غالب پر کتابیں اور غالب پر مضامین کثرت
سے نکل رہے ہیں؟ اچھا یہ کہنا بھی کسی ڈاکٹر بجنوری کا
ملک میں مشہور آج کل کے لوگوں کو بھی یہ دھوکا ہو کہ میں نے
اپنی شہرت کی ساری وجہ اپنے فارسی کلام کو جانا تھا اور اُردو
کی قدر و اہمیت کو میں نہ سمجھتا تھا۔ یہ ایک مزے دار دھوکا
اُردو آگے بڑھ کر کیا کچھ ہونے والی تھی۔ اس کی جھلک میں نے
چکا تھا۔ میرے اردو کلام کے چند شعر جن میں فارسی زیادہ تھی
لوگ لے اڑے تھے اور یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ میں نے اردو غزل
کو کتنی چنچل، کتنی ٹکسالی، کتنی چٹپٹی، کتنی جیتی جاگتی، بولتی
چالتی چیز بنا دیا تھا۔ اگر میں اردو کی اہمیت کو نہ سمجھتا تو اپنے
ان خطوط کو جن میں میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا تھا اس
احتیاط اور اس اہتمام سے بچا کر نہ رکھتا۔ قریب قریب سب
سے چھوٹا اُردو دیوان میں نے چھوڑا تھا اور مجھے یقین تھا
سب سے زیادہ میرے ہی اشعار لوگوں کی زبان پر ہوں گے
اب یہاں مجھے بہت دیر ہو چکی۔ کتاب بیچنے والا بھی
دل میں کیا کہتا ہوگا۔ یہ ایک اخبار رکھا ہوا ہے۔ کیوں
مسٹر یہ آج ہی کی تاریخ ہے نا؟ اچھا تو آج ۲۲ جون

ہے۔ مجھے کچھ یاد ہے کہ میں ۱۸۶۹؁ء تک زندہ تھا۔ اس کے بعد دوسری دنیا کی زندگی تھی اور اس میں ماہ و سال کہاں! آج اس دنیا سے گئے ہوئے ستر برس ہونے کو آئے۔ اتنے بڑے عرصہ میں، میں محض اپنی شہرت اور کلیاتِ کا حال جان کر خیر ایک طرح خوش ہوں۔ لیکن یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ ہندوستان میں اب کیسی شاعری ہو رہی ہے۔ کوئی کتب خانہ تو پاس ہوگا۔ لوگ کسی ہارڈنگ لائبریری کا پتہ دے رہے ہیں۔ اچھا دیکھو یہاں کیا ہے۔ داغ، امیر، حالی، اکبر، اقبال، حسرت موہانی، جگر، اصغر، شاد عظیم آبادی، عزیز، جوش اور دوسرے شعراء کے مجموعے یہاں نظر آ رہے ہیں۔ ان میں داغ اور امیر کو تو میں پچھلی زندگی ہی میں جانتا تھا۔ حالی تو میرے سب سے ہونہار شاگردوں میں تھے۔ اکبر سے بیسوں برس پہلے اس دوسری دنیا میں ملا تھا جہاں سے خود آیا ہوں اور جہاں تمام مرے ہوئے شعراء کے ساتھ یہ سب بزمِ سخن کی رونق بن گئے ہیں۔ وہاں اکبر کا ساتھ چھوڑنے کو تو جی نہیں چاہتا تھا اور اقبال تو ابھی ابھی وہاں پہنچے ہیں۔ اس شخص کی شہرت وہاں برسوں پہلے پہنچ چکی تھی۔ اور فرشتوں کی زبان پر اقبال کے نغمے برسوں پہلے سے تھے۔ میں نے اردو میں جس طرح کی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی، شاعری کو جو عظمت دینا چاہتا ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک وید اور دوسری دیوانِ غالب۔ تو صرف رہنا سہنا ہی اس ملک کا نہیں بدلا ہے بلکہ مذاقِ شاعری کی بھی کایا پلٹ گئی ہے۔ ہاں اب آپ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوں۔ شکریہ۔ اب میں اپنے اس شعر کو کیا کہوں سے

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

پہلی زندگی میں دوسروں کی شہرت کے کھیل دیکھے تھے۔ مرنے کے بعد اپنی شہرت کے کھیل دیکھ رہا ہوں۔ وہ زندگی کی ستم ظریفی تھی یہ موت کی بخشش ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس مرقع چغتائی کو کیا کہوں۔ اگر میرے اشعار تصویر کے نیچے نہ لکھے ہوتے تو میں بھی ان تصویروں کو نہ سمجھتا۔ خیر تو ان لکیروں اور رنگوں سے میرے شعروں کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔ نہ دیوانِ غالبؔ ہوتا نہ تصویر بنانے والا اپنا یہ کمال دکھا سکتا۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بہرحال غزل کے مطلب کو تصویر کے پردوں سے ظاہر کرنے کی ادا کو میں کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ زیادہ تر تصویریں بے لباس ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

خیر اتنا تو ہوا کہ "چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط" ایک جگہ کر دیئے گئے۔ حسینوں کے خط یعنی ان کی شوخ طبیعت ان کے چنچل مزاج کی وہ تصویریں جو میرے اشعار میں اکثر دکھائی دیتی ہیں اور یوں تو حسینوں کے خطوط بھی معلوم۔

"قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

خیر مشہور ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ میرا وہ فارسی کلام جس کا ہندوستان میں جواب نہیں تھا وہ اس دکان میں نظر نہیں آتا۔ میرے چند اشعار سے اگلے وقتوں کے لوگوں کو اور ممکن ہے

میری یہ کوشش اقبال ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ حسرت موہانی کا کلام دیکھا۔ مومن، جرأت، مصحفی کا نام اس کلام سے چمک گیا۔ جگر، اصغر، شاد، عزیز، چکبست اور سرور

جہاں آبادی۔ ان سب کی شاعری اپنی اپنی جگہ اونچی ہے لیکن کہیں کہیں روک تھام اور گہری نظر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھوں یہ یاس "یگانہ" کون شخص ہے اور اس کی آیات وجدانی میں کیا ہے۔ شعر تو جاندار ہیں۔ بیان کا طریقہ بھی کہیں کہیں استادانہ ہے۔ آتش کی گرما گرمی اور تیزی بھی مل جاتی ہے۔ لیکن غالب کا نام اس شخص پر بھوت کی طرح سوار ہے۔ خیر وہ کہیں اور سا کرے کوئی "مرزا قتیل" کی یاد تازہ ہو گئی۔ غالب نہ جانے کتنے شاعروں کی دکھتی ہوئی رگ ہے۔ میں اردو کی مسلسل نظم کی ترقی دیکھ کر خوش ہوں۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیان کے لئے

غزل ہو یا نظم سنجیدگی اور مذاق کی پاکیزگی، معنی آفرینی اور پست خیالی سے بچنا وہ خوبیاں ہیں۔ جو شاعری کو پیغمبری کا درجہ دیتی ہیں۔ ہاں کچھ عجیب اور غلط باتیں بھی میرے بعد کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک صاحب غالب کی جانشینی کا دعویٰ یوں کرتے ہیں کہ جس طرح میر کے سا ٹھ برس بعد غالب کا زمانہ آیا اسی طرح غالب کے سا ٹھ ستاسی برس بعد بھی بیوقوف دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اپنے کچھ اچھے کچھ برے اشعار کو لوگ الہام بھی بتانے لگے ہیں۔ اپنی غلط اور بے ڈھنگی نقالی بھی دیکھتا ہوں۔ بہت ہو رہی ہے۔ مہمل فارسی ترکیبیں ایک رسمی قسم کی مشکل پسندی، لفظ پرستی اور شعریت سے معرا بلند آہنگی اور اظہار علمیت یہاں تک کہ غیر موزون کلام کو بھی شاعری بتانا، یہ سب باتیں بھی آج کل کے شعراء میں آ گئی ہیں۔ میں اردو نثر اور اردو رسالوں اور اخباروں کی کثرت اور اب آب و تاب دیکھ کر بھی خوش ہوں۔ رقعات غالب گویا اس بات کی پیش گوئی تھے۔ یہ سب صحیح، لیکن دلی کی پچھلی صحبتیں یاد آ گئیں اور دل کو تڑپا گئیں۔ اب دلی میں نہ مومن، شیفتہ نہ حالی نہ داغ نہ مجروح نہ انور اور نہ

ہیں۔ خیر شعر و شاعری ہی ساری زندگی نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوا کہ ملک پھر بیدار ہو رہا ہے۔ اس کی تمام قومیں مل کر ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اپنا شعر مجھے یاد آیا ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

میری نظریں یہ بھی دیکھ کر خوش ہیں کہ انگریزوں کی تہذیب ان کے علم و فن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی ہندوستان اپنی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ پھر سے چاہتا ہے۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

آم پک رہے ہیں۔ لیکن اب اس دنیا کے آم کیا کھاؤں جن کے بارے میں میرا قول تھا کہ میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں۔ یہ تو جنت کا پھل ہے اور وہاں کے آم سیر ہو کر کھاتا ہوں۔ اب شام ہو رہی ہے۔ میں صرف ایک پل کے لئے دنیا میں آیا تھا۔ شاید مجھے آئے ابھی کچھ وقت نہیں ہوا۔ اور پل مارتے میں نے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ دوسری دنیا کا ایک پل اس دنیا کی کئی صدیوں کے برابر ہوتا ہے۔ ہم اہل عدم ایک پل میں جو کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ دنیا میں ان کے لئے ایک عمر چاہیئے۔ اب نہ وہ دلی ہے نہ ستر برس پہلے کا زمانہ۔ نہ مرزا ہر گوپال تفتہ ہیں کہ اس بے سروسامانی میں میری پیاس بجھائیں۔ اب تو قرض کی بھی نہیں پی سکتے۔ اخباروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شراب اس ملک میں بند ہونے والی ہے۔

مے بہ زہاد مکن عرض کہ این جوہر ناب
پیش این قوم بہ شوربائے زمزم نرسد

ہندوستان بہت بدل چکا ہے۔ لیکن اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتا ہے ابھی باقی ہیں ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں!!

(ختم شد)

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

پنڈت کیلاش ناتھ کول میکش کاشمیری

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

مرزا کے کلام پر خود اُن کا یہ قول حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔ سارے اُردو شعرا کے دیوان کھنگال ڈالیے مگر اُن کا سا انداز بیان اور ان کی سی بات کہیں نہیں ملتی اُردو شاعری میں غالب کی انفرادیت بلاشک مسلّم ہے۔ وہ صرف اس لئے عظیم نہیں کہ انہوں نے ہمارے لئے بہت سے ادبی جواہر پارے چھوڑے ہیں بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ہمیں ایک نیا اسلوب فکر اور ایک نیا مسلک شاعری سکھایا

ع اب کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مرزا نے اپنی گل افشانی گفتار سے ہر چھوٹے بڑے کا دل موہ لیا ہے۔ کیا نثر، کیا نظم کیا اُردو، کیا فارسی غالب سب پر غالب ہیں۔ انہوں نے مخصوص انداز میں زندگی کے مسائل اور رموز کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور ایک ادائے خاص کے ساتھ ؎

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

اُن کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اُن کا تفکر ہے۔ اُن کا سا فکر عالی ہرگز کہیں نہ ملے گا۔ انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کو ایک جدید رجحان اور ترقی پسند شعور عطا کیا۔ بقول ڈاکٹر اقبال ؒ ؎

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا !

غالب کی غزلوں کا موضوع نہ دل ہے نہ دماغ، وہ کسی خاص نے کے پابند نہیں تھے۔ خود فرماتے ہیں ؎

نالہ پابند نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

یہی وجہ ہے کہ ہر طبیعت اور ہر مزاج کا آدمی اُن کے کلام سے دلچسپی لے سکتا ہے۔ گویا دیوان غالب ایک آئینہ ہے جس میں ہر ناظر کو اپنی شکل نظر آ جاتی ہے اور یہی خصوصیت اس شاعر اعظم کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے صحیح پیشین گوئی کی تھی ؎

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

اس ہر دلعزیز اور محبوب شاعر کا انداز بیان اس دلفریب اور پُرکشش ہے کہ اُن کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات جادو کا اثر ثابت ہوتی ہے۔ گفتۂ غالب کا یہی تو سب سے بڑا وصف ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

یا پھر یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا !
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لفظوں کے رکھ رکھاؤ میں مرزا کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے الفاظ اور اُن کی حسین و نادر ترکیبیں اپنا جواب نہیں رکھتیں اُن کے الفاظ کا معانی سے ایسا ربط و ضبط ہے جیسے پھول کا خوشبو سے اور مہر و مہ کا تنویر سے۔ اُن کے کئی اشعار خیال، زبان اور بیان کے لحاظ سے نادر شہ پارے سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

مولانا حالی رقمطراز ہیں کہ "اُردو میں ایسے بلیغ اشعار شاید و باید دو چار ہی نکلیں گے۔" ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں اس خوبی اور نفاست سے بیان کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہو جائے صرف مرزا ہی کا حصہ تھا زبان کی خوبی اور مضمون کی دلکشی کی بدولت ایک شعر ملاحظہ فرمائیے جو سحرِ حلال کے درجے کو پہنچتا ہے۔ یہ شعر غالب کے نشتروں میں سے ہے۔ شعر کی بے ساختگی اور تیکھا پن ملاحظہ فرمائیے ؎

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

بقول طباطبائی "یہ شعر رنگِ سنگ میں گوہر شاہوار ہے۔" آسی فرماتے ہیں۔ "اس شعر کی بندش میں وہ چستی ہے جس کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔" مختصر یہ کہ ندرتِ خیال، حسنِ کلام اور لطفِ بیان کے کتنے ہی ایسے دلآویز اشعار مرزا کے دیوان میں ملتے ہیں۔ غالب کے ہاں تخیل، طرزِ ادا، تشبیہات، استعارات، محاکات، تراکیب غرض ہر چیز میں جدت ہے۔ وہ صاحبِ طرز اور مجدد الوقت تھے۔ معمولی سے معمولی اور پامال ترین مضمون کو بھی اس انداز سے بیان کرنا کہ ذوقِ سلیم وجد کرنے لگے انہی کا حصہ تھا۔ اُن کے کلام میں خیال آفرینی ہے محض قافیہ پیمائی یا زبان کا چٹخارہ نہیں خود فرماتے ہیں ؎

غالب بود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلم است کہ برکلک و ورق می کنم امشب

انہوں نے کیا کچھ نہیں کہا اور کن موضوعات پر خامہ فرسائی نہیں کی۔ مسائلِ تصوف ہوں یا رموزِ حیات، معاملہ بندی ہو یا حُسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ، غالب ہر جگہ بے کراں نظر آتے ہیں۔ مسلم الثبوت اساتذہ کے سینکڑوں اشعار میں اُن کا ایک شعر رکھ دیجئے وہ جواہرات میں ہیرے کی طرح دمکتا ہوا نظر آئے گا اُن کے لفظ لفظ میں ایک بات ہے اور ہر بات میں معانی کا ایک دفتر خود فرماتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

غالب ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے۔ وہ نوائے سروش کے قائل تھے۔ خود فرماتے ہیں ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالب نے کائنات کے مظاہر کی بے حقیقتی کو بڑے مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے ؎

۱۔ جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

۲۔ ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

۳۔ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ساری کائنات میں وہ صرف ایک ذاتِ گرامی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ وہ وحدت کے پرستار تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں وحدت الوجود کا تصور موجود ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

۱۔ ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

۲۔ قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

اُن کی نظر میں موج و حباب کا کوئی الگ وجود نہیں بلکہ ایک ہی بحر کے مظاہر ہیں۔ مثلاً ؎

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

مخلوق میں خالق کا عکس دیکھنے والے مرزا کے کتنے ہی اشعار اس نظریہ کے حامل ہیں، اُن کی شاعری میں پیامِ خودی بھی ہے۔ مثلاً ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

وہ کسی کو راہبر بنانا اپنی شان اور مسلکِ عالی کے خلاف سمجھتے تھے۔ مثلاً ؎

۱۔ لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

۲۔ کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

واعظ و زاہد سے بھی مرزا کے دو دو ہاتھ ملاحظہ فرمایئے ؎

واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

کیا لطیف طنز ہے! ؎

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

شبنم اور آفتاب کا مضمون بھی غالب کی طبیعت کو بے حد مرغوب تھا ؎

۱۔ پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

۲۔ خورِ شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسد
سرتاپا گزارشِ ذوقِ سجود تھا

مرزا کی نمایاں خصوصیت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے۔ وہ ہر دکھ درد کو ہنسی خوشی کاٹ دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ رجائیت کی بہترین مثال ملاحظہ فرمایئے ؎

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

رنج و مصائب کے بارے میں کس فلسفیانہ شان سے فرماتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

انہیں شکایت ہے کہ بوالہوسی نے اہلِ نظر کی ساکھ کم کر دی ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

انہوں نے انسانی عشق کی حقیقت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

خمریات میں بھی غالب کا مقام نہایت بلند ہے۔ حدیثِ بادہ و مینا و جام کی کتنی ہی مثالیں مرزا کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً ؎

۱۔ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

۲۔ میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا!

۳۔ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

۴۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

۵۔ کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

اب غالب کے وہ شعر ملاحظہ فرمایئے جن سے پڑھنے یا سننے والوں کے دلوں میں گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ ظرافت اور شوخی کی چند زندہ مثالیں ملاحظہ فرمایئے ؎

۱۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

۲۔ میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

۳۔ چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

۴۔ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا!

عزیزِ دہلی، جمنا پار کی دہلی، جگہ جگہ پر شیوں والی دہلی، بینکوں اور ہوٹلوں کی عظیم الشان عمارتوں والی۔ تمہاری دہلی جو قلعۂ معلّی سے بلیماران تک محدود تھی۔ اب پھیل کر ایک براعظم بن گئی ہے۔ تم سے تو پہچانی بھی نہیں جائے گی۔ انکل! لال قلعہ اگرچہ وہی ہے۔ لیکن اس کی دیوار کے سائے میں لڑکی پتی چھوکرے اور چھوکریاں بیٹھ کر چرس کے دم لگاتے ہیں اور تمہارا شعر پڑھتے ہیں کہ سے

"دم" سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو۔
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے۔

اور لال قلعے کے اندر جہاں کبھی مینا بازار لگتا تھا اور مغل شہزادیاں اپنے حسن وجمال کی چکاچوند کے ساتھ تفریح کے طور پر سیلز گرل بن کر بیٹھا کرتی تھیں۔ وہاں اب سموسے اور آلو کی ٹکیاں اور مونگ پھلیاں بکتی ہیں۔ قلعۂ معلّی کے اندر جہاں کبھی بہادر شاہ ظفر کی زیر صدارت میں ہنگامہ خیز مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ آجکل وہاں تمہاری روح کو خوبصورت خراج دینے کے لئے اردو مشاعرے منعقد ضرور ہوتے ہیں۔ جن میں وارداتِ قلب و جگر کی بجائے پانچ سالہ پلان کے تذکرے کئے جاتے ہیں۔ اردو مشاعرے کے ساتھ ہندی کا مشاعرہ بھی گھس بیٹھ گئے ہیں کیونکہ اردو جو کبھی قوم کی نکھری ستھری زبان سمجھی جاتی تھی۔ اب سٹینڈرڈ لاسٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندی اب قلعہ معلّی کی نیشنل بھاشا بن گئی ہے۔ اس نے ادب و علم کا تاج اس نے اردو کے سر سے چھین کر اپنے سر پہ پہن لیا ہے اور اب تو سنا ہے انکل! وہاں پنجابی زبان کا ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ مغل سلطنت کا زوال تو سنا تھا لیکن اردو مشاعروں کا زوال اس سے بھی زیادہ عبرتناک ہے۔

مگر اس زوال کے باوجود انکل! ہم تمہارا صد سالہ جشن منا رہے ہیں اور غضب خدا کا کہ جن لوگوں نے اردو کو دیش سے نکال دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا وہی بڑھ چڑھ کر تمہارا جشن منا رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھ پاتا کہ یہ جشن ہے یا ماتم۔ اور یہ ماتم غالب کا ہے یا اردو کا۔ حیرت ہے کہ اس ماتمی جشن میں دہلی کے جن سنگھی حکمران بھی شرکت فرما رہے ہیں۔ تم نے ایک بار رقیب کے متعلق تحریر کیا تھا کہ وہ محبوب کے ساتھ تمہارے گھر کی طرف آیا تھا تو تم جل بھن کر کباب ہو گئے تھے۔ لیکن اب پھر وہی تمہاری محبوبہ اردو کا رقیب تمہارا جشن منانے کے لئے لال قلعے کی طرف بڑھ رہا ہے اور تم سے

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

انکل! یہ خط میں بلیماران کے ایک چائے خانہ کی چوبی بنچ پر بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ تمہارے گھر کے سامنے ہے، جو اب تمہارا گھر نہیں لگتا بلکہ ماتم کدہ لگتا ہے اور میں سوچ رہا ہوں۔ آخر اس ماتم کدے میں غالب کا جشن منانے کی کیا ضرورت ہوگی۔ ورنہ بقول تمہارے غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔

طاؤس شرح (ص ۳۰ سے آگے)

ہمارے ساتھ بڑا تپاک بتایا اور شوق کے دماغ کے بال جلا دئے۔ یہ امر ہمیں بہت خوش آیا اور اسے ہم نے تیرے خلوص و تپاک کی نشانی سمجھا۔

کسی کے بال جلا دئے جائیں اور سر پہ داغ دے دیا جائے تو اسے دشمنی کی علامت سمجھا جائے گا۔ لیکن اردو کا شاعر اور عاشق تو الٹے دماغ کا ہوتا ہے۔ اس کے لئے سوزش و داغ سب سے بڑی متاع۔ داغِ تمنا سے سوائے آتش زنی کے اور امید ہی کیا ہو سکتی ہے۔ داغِ تمنا حسرتوں کا داغ ظاہر ہے کہ یہ شوق کو پھونک کر اس میں اعتدال لائے گا۔

بے دماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہیں
یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا

بے دماغی: نازک مزاجی، دوسرے کی پرواہ نہ کرنا۔ تو بھی بے دماغ ہے، میں بھی بے دماغ ہوں۔ ہم دونوں کو نہ ایک دوسرے سے رشک ہے نہ ایک دوسرے سے شکوہ۔ تیرے پاس جامِ شراب ہے، میرے پاس صرف انگڑائی جو شراب نہ ملنے کی نشانی ہے۔ اس کے باوجود بے دماغی کے سبب ہم ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ ظاہر ہے یار کے پاس سب کچھ ہے۔ ان کے پاس کچھ نہیں پھر بھی بے نیازی کا عالم ہے۔

ریاست کے جواں سال ادیب جیوتیشور پتھک کا ناولٹ "میرے شہر کے شہزادے" اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

از جناب اختر اورینوی، صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ

اردو شاعری اور غالب (ایک مطالعہ)

اُردو شاعری کی تاریخ میں غالب کا مقام بہت بلند ہے ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب کی عظمت کی وجہ صرف اس کا انداز بیان ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ شاعری کا تعلق شاعر کی شخصیت سے بہت گہرا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ خارجی ماحول کا اثر شاعری پر پڑتا ہے۔ غالب کی شاعری پر بھی اس عہد کی زندگی کا اثر پڑا ہے۔ لیکن یہ اثر تو سبھوں پر پڑا تھا۔ ذوقؔ، مومنؔ، نصیر دہلوی اور دوسرے شاعروں پر۔ لیکن جن خصوصیات نے غالب کو غالب بنا دیا وہ خارجی نہیں داخلی تھیں۔ فنونِ لطیفہ کی تخلیق فن کار کی باطنی زندگی سے زیادہ وابستہ ہوتی ہے۔ اگر فن کی مثال پھول سے دی جائے تو بہت حد تک صحیح ہے۔ پھول کا قد، رنگ اور بُو اور اس کی مجموعی دل کشی و دل نوازی صرف ماحولِ چمن سے وابستہ نہیں بلکہ چمن کی مٹی کی اندرونی تہوں سے بھی وابستہ ہے۔ نکہت گل کا سبب صرف صبا و نسیم نہیں، صرف سورج کی کرن نہیں، صرف نیرنگ موسم نہیں بلکہ آب و گل کا رس اور جس بھی ہے۔ اور نیز یہ بر حق ہے کہ بیج یا قلم کی نوعیت بھی تقدیر گل بناتی یا بگاڑتی ہے۔

غالب اور اقبال صرف پروردۂ ماحول نہیں۔ اُن کی شخصیت ان کی داخلی زندگی، ان کا ذہنی و نفسی ماحول، ان کے دل کی دھڑکنیں، ان کے جذبات کا خاص اُتار چڑھاؤ، ان کے خیالات و افکار کی منفرد لہریں، اُن کی نفسی ہم آہنگیاں اور پیچیدگیاں، خارجی زندگی کے مقابل اُن کا مخصوص رَدِ عمل، یہ اہم باتیں غالب اور اقبال اور اُن کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ان کے زمانے کے میلانات سے زیادہ ضروری ہیں۔

مختصر یہ کہ غالب کی شخصیت کے خد و خال کو سمجھے بغیر ہم اس کی شاعری کی اہمیت پورے طور پر محسوس نہیں کر سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ انداز بیان کی انفرادیت بھی شخصیت کی انفرادیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ غالب کی شخصیت میں کچھ انوکھا پن تھا اسی لئے اس کے انداز بیان میں بھی ایک نرالی شان پیدا ہوئی غالب کی شخصیت کے عناصر ترکیبی پر اس کے زمانے کا اثر ضرور پڑا ہے۔ لیکن ان اثرات کا جو نتیجہ نکلا وہ مخصوص رنگ کا نتیجہ تھا۔ بات یہ ہے کہ اسباب اور نتائج کی کڑیاں ملانی آسان نہیں۔ یہ بڑا پیچیدہ عمل ہے۔ میں نے تمہید میں یہ باتیں اس لئے عرض کیں کہ آجکل زندگی کے خارجی میلانات اور فنونِ لطیفہ کے ربط و تعلق پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک خارجی ماحول اور سماجی میلانات کی کافی اہمیت ہے۔ لیکن آدمی آدمی پر ماحول کا الگ الگ طور پر اثر ہوتا ہے۔ اور آرٹ کا معاملہ تو بہت زیادہ لطیف، نازک، گہرا، بلند، مرکب در مرکب اور نہایت ہی پیچیدہ ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ غالب نے اپنے زمانے کی زندگی کو ایک خاص تیور سے دیکھا، اسے مخصوص انداز میں محسوس کیا اور اپنا ایک منفرد فلسفۂ زندگی بنایا۔ غالب نے اردو غزل کی تنگ دامانی کو محسوس کیا اور اُس نے اپنے ماحول کو بھی تنگ داماں پایا۔ ذوق

اپنے ماحول میں کھپ سے گئے ۔ اور مومن نے حُسن و عشق کے خلوت خانوں میں پناہ لی ۔ مگر غالب نہ حسن سے مطمئن ہوا، نہ عشق سے، نہ رنگ سے نہ بے رنگی سے، نہ اُمید سے نہ مایوسی سے، نہ اپنے سے، نہ خدا سے ۔ غالب ایک تحیّر آمیز سوالیہ نشان ہے ۔ وہ ایک بے چین روح ہے، ایک متشکک و مضطرب شخصیت ہے ۔ یہ ساری علامتیں غالب کی شاعری میں جھلکتی ہیں ۔ غالب کا محبوب ہی نکتہ چین نہیں خود غالب بھی نکتہ چین ہے ۔ وہ خود اپنے کو بھی غمِ دل نہیں سُنا سکتا ۔ وہ آن مشکوک اور متجسس ہے ۔ وہ بے اطمینانی کا شکار ہے اور عقدۂ ہستی کو سلجھانا اور رازِ کائنات کو سمجھنا چاہتا ہے ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں!
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

غالب زندگی کی گتھی نہ سلجھا سکا ۔ اور اس ناکامیابی کا اسے تلخ احساس ہے ۔ کہتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن غالب اس مسئلے کی بنیاد تک پہونچتا ہے ۔ کہتا ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

وہ زندگی سے مجموعی طور پر ناخوش ہے ۔ اصل یہ ہے کہ وہ جس طرح زندگی کو سمجھنا چاہتا تھا، سمجھ نہ سکا، اس لئے بیزار وہ بے یقین ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب کہتا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

زندگی کے المیے کے متعلق غالب کا ردِ عمل گہرا ہے ۔ مندرجہ ذیل شعر سے غالب کے محسوسات کا مقابلہ کیجیے تو فرق معلوم ہوگا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوقؔ)

لیکن غالب کی نظر زیادہ گہری ہے اور اس کے تصورات زیادہ لطیف اور ہمہ گیر ہیں ؎

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

غالب کی ذہنی کیفیت اس شعر سے ظاہر ہوتی ہے ؎

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

غالب لاف دانش کو بھی غلط کہتا ہے ۔ اور اس کے نزدیک نفعِ عبادت بھی معتبر نہیں ۔ مندرجۂ ذیل شعر کتنا جدید معلوم ہوتا ہے ۔ غالب اپنے زمانے سے آگے دیکھتا ہے ؎

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

غالب پر کبھی رومانی فرار و گریز کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

لیکن غالب کو فرار و ہجرت سے بھی تسکین نہ ہوئی۔ وہ نہ تو بے در و دیوار سا ایک گھر بنا سکا۔ اور نہ کسی اور ڈھنگ کا گھر۔ اُسے ہمیشہ حسرتِ تعمیر رہی۔ غالب کی حسرت جذباتی سے زیادہ ذہنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب ایک مثالی دُنیا اور ایک مثالی محبوب کے لیے مرتا ہے۔ کہتا ہے ؎

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب پر فانی کی طرح جذبۂ فنا بھی طاری ہوتا ہے۔ وہ خود کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ مگر یہ جذبہ مستقل نہیں ؎

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

غالب کی شخصیت میں بلندی، اس کے مزاج میں وقار و پندار اور غیرت تھی۔ یہ اور بات ہے کہ زمانے سے ٹکرا ٹکرا کر اس کی غیرت مجروح ہوتی گئی۔ مگر اسی نسبت سے طبیعت کی تلخی بڑھتی گئی۔ غالب انفرادی خودی کا قائل ہے۔ اور اس کا عروج چاہتا ہے۔ غالب کا اجتماعی احساس بالیدہ نہیں۔ بہرکیف، جماعت اور سماج کیا ہیں۔ وہ افراد کا مجموعہ ہی تو ہیں۔ غالب کی شاعری میں پیامِ خودی بھی ہے۔ اگر افراد اسرارِ خودی کو سمجھ جائیں تو سماج کا بھلا ہو۔ غالب کے پاس زندگی کی بلند قدریں بھی ہیں۔ اور وہ ان اخلاقی قدروں سے محبت بھی کرتا ہے۔ ایک فنکار کے لئے اس کی خودی اور قدریں اس کے فن کے لئے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ فن میں ایمان و یقین سے رُوح اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی "ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود اس کی" اور "مقصود سِرّ حرزِ حیاتِ ابدی ہے"۔ غالب کی شخصیت میں خودی کی جھلک ملاحظہ ہو ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

واں، وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے۔

غالب کی شاعری میں فکری عنصر نمایاں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمالیاتی عنصر بھی موجود ہے۔ غالب اگر ایک سنگدل بت شکن ہے تو دوسری جہت سے وہ ایک بت گر بھی ہے۔ غالب کی فنکارانہ صنم سازی جنتِ نگاہ ہے۔ اور غالب کی تخلیقی نغمہ گری فردوسِ گوش۔ اُسے یہ شدید احساس تھا کہ غزل کا پیمانہ اس کے بقدرِ ذوق نہیں ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب کے بت خانۂ تصور کی سیر کیجئے اور اس کی صناعانہ صلاحیت سے لطف لیجئے۔ کاش غالب اپنے زمانے کی بندش آفرینی سے آگے بڑھ کر دادِ تخلیق دیتا۔ اس کی شاعری ہر

جو مصوری ہے اس سے ایشیا کا ایک عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی بہت گہرے طور پر متاثر ہوا ہے ۔ غالب کی شاعرانہ مصوری میں تخیل کی رنگ آمیزی ہے اور جذبہ کی آنچ سے

کوہ و صحرا ہمہ معموری شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

کتنی لطیف اور نازک مصوری ہے ۔ سے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

بس کہ ہے دماغ آج کل ہے ہاتھ اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

ہیں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آیئے اس صحبت کا اختتام غالب کے اسی شعر پر کیا جائے۔ ایشیا کا وہ عظیم کلچر جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر بنایا تھا ۔ اس کے بہت سے حسین اظہارات ہوئے ہیں۔ اور اس کا ایک گویا اظہار غالب تھا ۔ غالب جس نے ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی دیکھی ۔ غالب جس نے سلطنتِ مغلیہ کے چراغ کو گل ہوتے ہوئے دیکھا ۔ غالب جس نے انگریز حاکم سے ہاتھ ملانے کو اپنی تضحیک سمجھی ۔ غالب جس نے بہادر شاہ ظفر آخری تاجدارِ ہند کو غریب الوطنی میں اس جہانِ فانی سے گذرتے دیکھا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غالب پھر اس دُنیا میں (صد سے آگے)

غیر شراب سے نشاط اور خوشی کس کا فر کو درکار ہے ۔ یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے اور وہ بے خودی مجھ پر چھا چکی ہے ۔ دنیا کے حسن کے کرشمے دیکھ چکا ۔ میں اسی تماشہ کو قیامت کہتا ہوں ۔ میں خاک ہو چکا تھا ۔

بجز پرواز شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

پھر آنکھ کھل گئی ۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی ۔

غالب اور فارسی

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است!

ہمارے مکاتیب

جالندھر
۱۴ فروری سنہ ۱۹۶۹ء

محبی و محترمی باور صاحب

تسلیمات! رسالہ نوری چھم نظر نواز ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ رسالہ کے ٹائیٹل پر نظر پڑی تو غالب کا وہ شعر یاد آیا

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جان نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

نثر کے مضامین نہایت دلچسپ اور حصۂ نظم جاذب نظر یہ ایک گلدستہ ہے جو آپ کے حسنِ نظر اور پختگیٔ شعور کی دلیل ہے۔ آپ نے مضامین اور نظمیات کے انتخاب میں ادبی معیار کا خاص خیال رکھا ہے جو قابل داد ہے۔ اُمید کرتا ہوں کہ اہلِ نظر اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور آپ کا رسالہ ادبی دنیا کے سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ تصور ہوگا۔

خیر اندیش
ساحر (سیالکوٹی)
۳۱۹/A کاسنٹرل ٹاؤن جالندھر

سوزنکوٹ
۱۱ فروری سنہ ۱۹۶۹ء

مکرم و محترم جناب باور صاحب

آداب! نوری چھم آنکھوں کے سامنے آیا۔ آنکھوں کو طراوت، دل کو سرور اور روح کو تسکین نصیب ہوئی۔ اس انحطاط اور قحط سالی کے دوران ادبی خدمات کا یہ گراں بار اُٹھانا۔ آپ جیسے ہی ایک بلند حوصلہ اور جواں مرد کا کام ہے۔ اور پھر اردو ادب کے اس لق و دق صحرا میں جہاں لالہ زار بھی ہیں گلزار بھی۔ نیز خار بھی ہیں اور بے برگ و گیاہ ریگزار بھی اور جہاں کبھی کبھی بادِ خزاں بھی چل کر اس کی شادابی کو قدرتے مضمحل کر دیتی ہے۔ اس وسیع بوستان کی آبیاری کا بیڑہ اٹھانا ایک جیالے کا کام نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر جموں وکشمیر میں جہاں اُردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ تو حاصل ہے۔ وہاں اس کا کوئی محسن نہ تھا جو اس کی مشاطگی کرتا۔ اسے نکھارتا سنوارتا اور اس کی ترویج کے لئے اپنی بے لاگ خدمات وقف کرتا۔ غرض اس سے لینے والا تو ہر کوئی تھا۔ مگر اسے دینے والا کوئی نہ تھا۔

"نوری چھم" کی ابدی اور لافانی زندگی جو ہندوستان کی عظمت اور حسنِ مذاق کی ایک کھلی نشانی ہے۔ زمانے کی نیرنگیوں کے ہاتھوں مٹتی جا رہی تھی۔ اُسے نئی روح عطا کرنا اسے جلا دینا۔ آب و تاب دینا۔ ہندوستانی زبان اور ہندوستانی عظیم تہذیب کو ایک بار پھر زلیخا کی سی جوانی دینا کسی یوسف کا ہی کام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب تک چاند اور ستارے اپنی ٹھنڈک اور چمک بخش روشنی دیتے رہیں گے جب تک سورج اپنی پوری آب و تاب سے مشرق سے نمودار ہوتا رہے گا۔ نوری چھم اپنی سنہری خوشبو بکھیرتا رہے گا۔ ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتا رہے گا۔ اتحاد و یگانگت اور یکرنگی اپنی اس دھارا سے تاقیامت پیش کرتا رہے گا جس کا پانی ساون بھادوں میں طغیانی پر آ کر بھی بکھرتا نہیں۔ بلکہ اتحاد و اتفاق کا عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے ہر دیکھنے والے کا دل دہلا دیتا ہے۔ خزاں یا گرما کے خشک موسموں میں جب دوسری کئی ندیاں سوکھ جاتی ہیں "نوری چھم" اپنے منبع کے قریب برف کے تودوں سے بافراط پانی کا خزانہ حاصل کر کے اپنی قوت اور جوانی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا۔ کئی ندیاں اپنی گذرگاہ تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ جہاں ایک طرف کوئی سنگلاخ پتھر یا پہاڑی آ گئی۔ تو دوسری طرف نرم زمین کو کاٹ کر اپنا رُخ بدل دیتی ہیں۔ لیکن نوری چھم۔ ۔ ۔ نوروں والا نوری چھم۔ ۔ ۔ جس نے اپنا جادہ کبھی تبدیل نہیں کیا۔

سیکڑوں سال پہلے جس راستہ پر چل رہا تھا۔ آج بھی اسی راستہ پر چل رہا ہے اور ایک سنگلاخ پہاڑ کو اپنی نرمی اور نزاکت سے کاٹ کاٹ کر ایک دلفریب اور پُر جلال نظارہ پیش کر رہا ہے۔ اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ نرمی، محبت اور اتحاد کی طاقت ایک اٹل، اٹوٹ اور امر شے ہے۔ اِس طاقت کو نہ تو کوئی روک سکتا ہے اور نہ کوئی منتشر ہی کر سکتا ہے۔

"نوری چھم" دہلی اور کشمیر کے اٹوٹ رشتے کا ایک صادق گواہ۔ جہانگیر اور نور جہاں کے درباریوں سمیت کشمیر آنے کی داستان آج بھی سنا رہا ہے اور تا قیامت سناتا رہے گا۔ "نوری چھم" ہر ہندوستانی کا ہے اور ہر ہندوستانی کا مقدس فرض ہے کہ وہ "نوری چھم" کی بقا، عظمت اور سربلندی کا ضامن ہو۔

مخلص

حسام الدین بیتاب

ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول لٹھونگ سہنڈر پونچھ

کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر مضمون کو بہت اچھے پیرائے میں اور بہتر سے بہتر انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے مواد کے لحاظ سے یہ رسالہ اپنا ایک بلند مقام قائم کرے گا۔ پڑھنے سے جی اکتاتا نہیں۔ بلکہ شوق بڑھتا ہی جاتا ہے اور بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ رسالے کو ترتیب دینے کے لئے میں محنت و جانفشانی سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

میری دلی تمنا ہے کہ یہ جریدہ برصغیر کے تمام شاعروں اور ادیبوں کے بہترین تعاون کا سنگم ثابت ہو اور آئے دن ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

آپ کا مخلص

میر عبدالمجید پونچھی

بی اے، ایل ایل بی

وکیل پونچھ

چاندنی چوک۔ راجوری

۱۵ فروری ۱۹۶۹ء

محترم باوا صاحب۔ آداب

رنگا رنگ نگارشوں، حسن و تنوع اور خوبیوں سے معمور "نوری چھم" دیکھا، پڑھا اور جھوم اٹھا۔ آپ یقیناً بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ملک و قوم کی خدمت جس تن دہی، جانفشانی سے آپ کر رہے ہیں اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آپ کی جد و جہد بے غرض، آپ کی محنت دیانت قابلِ داد ہے۔ ایک سچے مخلص اور ایماندار انسان کی یہی پہچان ہے۔

دعا گو

سوم ناتھ ڈوگرہ، ایڈیٹر "میری سرکار"

مگر کوٹ۔ رام بن

۴ مارچ ۱۹۶۹ء

جنوری کا ماہنامہ "نوری چھم" کسی دوست کے توسط سے پڑھنے کو ملا۔ یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ ماہنامہ جموں سے شائع ہوتا ہے اور جناب باوا صاحب کی اس بلند ہمتی پر کہ اس دور میں اردو ماہنامہ جاری کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہماری ریاست کو ایسے ہی اردو ادب کے بلند معیاری ماہناموں کی ضرورت ہے۔ میں شری نند گوپال باوا جی کو ان کی پُر خلوص بلند ہمتی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

ستار کرامی ناظر

حمید منزل۔ پونچھ

۱۹ فروری ۱۹۶۹ء

محترمی باوا صاحب

آداب و نیاز

"نوری چھم" کا پہلا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت خوب! مطالعے

از جموں

۳ مارچ ۱۹۶۹ء

محترم منیجر صاحب نوری چھم رسالہ

آداب عرض ہے۔ آپ کا شائع شدہ رسالہ نوری چھم نظر سے

رسالہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ نے اردو کی خدمت کرتے کرتے پونچھ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور سرزمین پونچھ کو ایسا شرف حاصل ہوا کہ اس کے نام سے اردو کا بہترین ادبی رسالہ شائع ہونے لگا ہے۔ یوں تو پونچھ کا عظیم ورثہ ویسے ہی گم ہو گیا تھا مگر اسکی یاد کو آپ نے دوبارہ تازہ کیا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور ہماری دعا ہے کہ آپ اس رسالہ کو معراج ادب تک لے جائیں۔ سبق نو قرار دیں حصہ نثر سے ٹھاکر پونچھی، پشکر ناتھ، مالک رام آنند کے افسانے اور حصہ نظمیات میں سے جناب ساحر سیالکوٹی، درجیش گوہر، عرش صہبائی، پروفیسر منظر اعظمی، اور منیر جدید کا کلام پسند آیا۔ سنا ہے کہ آپ غالب نمبر نکال رہے ہیں۔ پونچھ کے عوام کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ میری طرف سے جملہ احباب کو آداب۔

سید ابوالقاسم رضوی

۱۴ فروری سنہ ۱۹۶۹ء

مکرمی باوا صاحب۔

ہدیۂ تسلیم و نیاز۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ آج نوری چھم ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ پونچھ کی دھرتی کو آپ جیسے مایۂ ناز سپوتوں پر فخر ہے۔ آج آپ نے اس ادبی ماہنامے کے اجراء سے جہانگیر نورجہاں کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ کر دی۔ اور اس رسالے میں مجھے سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ اس میں آپ نے اپنی جنم بھومی سے متعلق زیادہ تر کہانیاں دی ہیں۔ جناب چراغ حسن حسرت مرحوم کی غزل بھی فردوس نظر ہوئی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ رسالہ یہاں کافی مقبول ہوا ہے۔ آپ کا

برج موہن دتہ

جموں و کشمیر میں تعمیر و ترقی کی کہانی

آزادی و جمہوریت کی کامیابی اس بات میں پنہاں ہے کہ عوام کو تعمیر و ترقی اور ضروریات زندگی کی وہ سب سہولیات میسر ہوں جو کسی آزاد ملک کے شہری کے لئے لازمی ہوتی ہیں۔ مثلاً ترقی کے بہتر ذرائع، رسل و رسائل کی سہولیات، بجلی، امداد، معقول رہائشی انتظامات، بہتر اور سستی خوراک، پینے کے لئے [illegible]، کپڑے، بچوں کے لئے مفت تعلیم، زندگی کی اہم ضروریات کی فراہمی۔ ریاست جموں و کشمیر نے بھی [illegible] آزادی کے ساتھ ساتھ تعمیر و ترقی اور سماجی بہبود کے میدان میں آگے قدم بڑھائے ہیں۔ اپنے محدود ذرائع، مرکزی امداد اور عوامی تعاون کی وجہ سے گذشتہ کچھ برسوں میں ہم نے تیز ترقی کے نئے افق چھوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اہم کامیابیاں حسب ذیل ہیں:

- آج تک ریاست میں تین پانچ سالہ اور دو یک سالہ منصوبوں کو [illegible] کے ساتھ مکمل کر لیا گیا ہے۔ چوتھے پانچ سالہ پلان میں ریاست کے لئے ۱۵۸،۱۰ کروڑ روپئے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ اس پلان میں بھی غذائی پیداوار [illegible] خاص اہتمام کئے گئے ہیں۔
- آج کی اہم ضروریات میں بجلی کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس میدان میں ہم نے پچھلے برسوں میں [illegible] زیادہ اضافہ کیا ہے۔ جہاں ۱۹۴۷ء میں کل ۴ میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی وہاں آج ۴۳ میگاواٹ بجلی پیدا ہو رہی ہے۔ [illegible] اور جہلم اپر سندھ بجلی کے پروجیکٹوں پر کامیابی سے کام چل رہا ہے۔ سلال [illegible] پروجیکٹ جس سے [illegible] میگاواٹ بجلی پیدا ہوگی مرکزی سرکار اپنے ہاتھ میں لے رہی ہے۔ ان کی تکمیل کے بعد ریاست کی معیشت میں [illegible] ہوگی۔
- صنعت کے میدان میں کئی ایک اہم سکیمیں چالو کی جا رہی ہیں جن میں مرکزی حکومت کی طرف سے ٹرانسسٹر، ریڈیو، گھڑیاں اور ٹیلی فون بنانے کے کارخانے بھاری اہمیت رکھتے ہیں۔
- ۱۹۷۱ء تک جموں تک ریلوے گاڑیوں کا آنا جانا شروع ہو جائے گا۔
- ریاست میں زرعی پیداوار بڑھانے کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ گذشتہ سال یہاں ۲ء۲ لاکھ ٹن دھان اور ڈیڑھ لاکھ ٹن گیہوں پیدا ہوا جبکہ یہ پیداوار ۵۲-۱۹۵۱ء میں بتدریج [illegible] لاکھ ٹن اور [illegible] لاکھ ٹن تھی۔
- تعلیم کے میدان میں بھی ہم نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ ریاست کے دور دراز علاقوں میں بھی تعلیمی سہولیات میسر ہیں۔ آج ریاست میں جموں و سرینگر کے علاوہ ہر ضلع میں ڈگری کالج ہیں۔ کئی پیشہ ورانہ ٹیکنیکل کالج چل رہے ہیں۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی آج ایک مکمل یونیورسٹی ہے جس میں ۲۱ پوسٹ گریجویٹ شعبے کام کر رہے ہیں۔
- حفظان صحت کے لئے ریاست میں کافی توجہ دی جا رہی ہے۔ اور دور دراز علاقوں تک حفظان صحت کے انتظامات کو وسعت دی گئی ہے۔ آج یہاں ریاست کے ہر شہری پر ۱۲ء۹ روپئے سالانہ خرچ کیا جا رہا ہے جبکہ ۱۹۴۷ء میں یہ خرچ صرف [illegible] تھی۔
- سیر و سیاحت ریاست کی اہم صنعت ہے اور اس کا ریاست کی معیشت پر بھاری اثر پڑتا ہے۔ حکومت اس انڈسٹری کی وسعت کے لئے کئی اہم اقدامات کر رہی ہے۔ اس پروگرام کے تحت اس سال گلمرگ میں سرمائی کھیلوں کے خاص انتظامات کئے گئے ہیں۔ گلمرگ ٹنگمرگ سڑک کو گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ جموں میں شری ویشنو دیوی یاترا دن بدن مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ اس سال دو لاکھ یاتریوں کا گپھا میں درشنوں کے لئے آنا اس بات کا بین ثبوت ہے۔
- اس کے علاوہ ریاست میں رسل و رسائل، رہائشی سہولیات اور عوامی فلاح و بہبود کے میدان میں اہم اور نمایاں ترقی ہوئی ہے۔
- یہ تعمیر و ترقی کی رفتار دن بدن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس طرح وہ دن دور نہیں جبکہ ہم خوشحالی کی اپنی منزل کو حاصل کر لیں گے۔

الف۔ ایس۔ او